آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اپریل 2020

www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

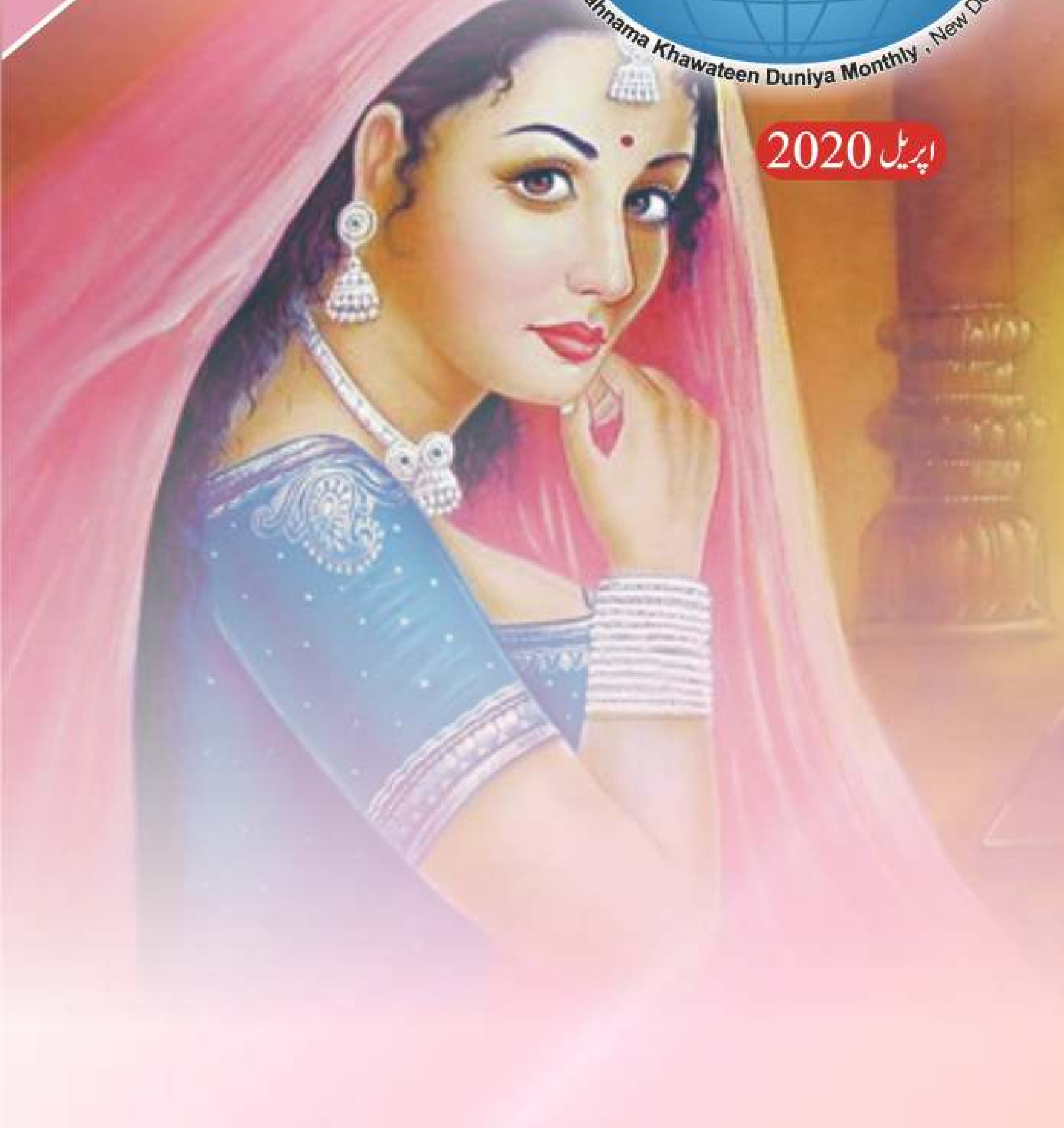

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

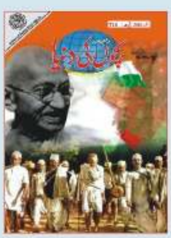

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	ایک ملاقات ڈاکٹر مینا نقوی سے	زیب النساء	5
شخصیت	شکیلہ اختر کے افسانوں میں عورت	ڈاکٹر شائقہ آفرین	9
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		12
جہان نسواں			
	اردو شاعری میں قومی ہم آہنگی کی روایت اور اقبال	ڈاکٹر افسانہ حیات	13
	جگر مرادآبادی کی شخصیت کے اہم نقوش	صبیحہ نسرین	18
	تانیثیت اور اردو ناول	آفرین فاطمہ	25
	پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری: موضوعات واسالیب	راحلہ پروین	29
	مجروح سلطانپوری کی شاعری میں انسانی قدریں	ارم نعیم	33
	عابد سہیل کے افسانوں میں فسادات کا ذکر	صبا	40
کہانیاں	اماں جی کا ابول	شیریں نیازی	44
	پرت	ڈاکٹر مہ جبین نجم غزال	48
حسن سخن	عائشہ فرحین		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	کرونا وائرس اور خواتین خانہ	ڈاکٹر اشرف آثاری	54
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		59
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:4 شمارہ:4 اپریل 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر مذہب کے ماننے والے لوگ موجود ہیں۔ یہاں سیکڑوں بولیاں بولی جاتی ہیں جو عوامی رابطے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ واحد ملک ہے جہاں رنگا رنگی اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ مختلف تہواروں کو یہاں کے لوگ اس طرح مناتے ہیں کہ آپسی رواداری اور محبت کو تقویت ملتی ہے۔

ہندوستان میں کثرت میں وحدت کا فلسفہ موجود ہے۔ آج قومی یکجہتی کے تصور کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں کی آب و ہوا، یہاں کا رہن سہن اور یہاں کے تاریخی مناظر سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب میں 'سرودھرم سمبھاؤ' کے نظریے کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لحاظ سے اپنے اپنے طور پر لوگ اپنے اپنے مذاہب میں عقیدت رکھتے ہیں۔ قابل غور امر یہ بھی ہے کہ ماضی میں جبکہ ہمارا ملک انگریزوں کے ماتحت تھا اس دور میں بھی تمام مذاہب کے لوگ انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے تھے اور ان کو یہ باور کرایا تھا کہ ملک کی بقا کے لیے ہر ہندوستانی اپنی جان تک کی قربانی دے سکتا ہے۔ اس وقت ملک کی سالمیت کے لیے قومی اور سیاسی رہنماؤں نے آگے بڑھ کر ہر وہ لڑائی لڑی جو ملک کے حق میں تھی۔ اس لڑائی میں ذاتی مفاد کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ہمارے قومی اور سیاسی رہنماؤں کا نظریہ اس وقت ذات اور مذہب سے اوپر تھا اور 'سرو جن ہتائے سرو جن سکھائے' ہی سب سے اہم تھا۔

انسان دوستی کی اس روایت کو ملک کے ان ادیبوں اور دانشوروں نے بھی فروغ دیا ہے جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ صوفی سنتوں نے بھی اس ضمن میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ انسان دوستی، صداقت اور سچائی ان کا ایمان تھا۔ انھوں نے انسانیت کا درس دیا۔ ان کے یہاں بھی اسی نظریہ کو تقویت حاصل ہے کہ تمام مذاہب ہمیں روشنی عطا کرتے ہیں اور انسانیت کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی قومی ہم آہنگی کے ابتدائی نقوش سولہویں صدی یا اس سے بھی پہلے ملتے ہیں۔ قومی ہم آہنگی میں جن عناصر پر زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے ان میں اتحاد، محبت انسان دوستی اہم ہیں۔ ہمارے بیشتر شعرا نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ تہذیب اور ثقافت کے بغیر کسی قوم کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ قلی قطب شاہ، نظیر اکبر آبادی، چکبست اور اقبال نے اپنی شاعری میں اتحاد اور حب الوطنی کے نغمے گائے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ پیغام عام کیا ہے کہ تمام مذاہب کا احترام لازمی ہے۔ مذہبی منافرت کی تمام شاعروں نے ممانعت کی ہے اور ایک ایسے معاشرے پر زور دیا ہے جہاں تمام مذاہب کو تعظیم کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ ہندوستانی تہذیب بھی اسی نظریہ کی حامل ہے۔

تصورات اور نظریات کسی عقیدے کے پابند نہیں ہوتے۔ اگر ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ کیا جائے اور حالات کا جائزہ لیا جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ تمام اختلاف کے باوجود یہاں کے لوگوں کے خیالات، جذبات ایک دوسرے سے بہت مماثلت رکھتے ہیں جو اس بات کے ضامن ہیں کہ ہند کے لوگوں میں ایک گہری وحدت موجود ہے۔ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ انتشار کی وجہ سے ہندوستان کی وحدت کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ہر دفعہ اتحاد کے ذریعے ہی ہندوستان دوبارہ نئے سرے سے ہم آہنگ ہوا ہے اور ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آئی ہے۔

آج ہم ایک نئے دور میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہمیں ترقی کے ہر میدان میں نئے نئے چیلینجز کا سامنا ہے۔ چاہے وہ تعلیمی میدان ہو، ثقافتی میدان ہو یا تکنیکی میدان یا ملک کی تعمیر و ترقی کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو غرض چیلنج ہر جگہ موجود ہے۔ ان چیلنجز کا مقابلہ ہمیں پوری محنت اور جانفشانی سے کرنا ہے اور ان تمام مسائل کا حل بھی تلاش کرنا ہے جو آج ہمیں درپیش ہیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

زیب النساء

ایک ملاقات ڈاکٹر مینا نقوی سے

زندگی نہیں رہتی مگر اچھی یادیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ یادوں کی بات چلی تو دل کی صدا نے اس ادیبہ کا ذکر کرنے کو کہا جو آج کینسر کی مریضہ ہیں اور حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ اس بیماری سے لڑتے ہوئے بھی ان کے لب ولہجہ میں کہیں تھکن دکھائی نہیں دیتی اس حال میں بھی انھوں نے اپنے ساتھی قلم کا ساتھ نہیں چھوڑا ان کے بلند حوصلہ کو ہم سلام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مینا نقوی کو ادب کی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر مینا نقوی ایک شاعرہ ہیں، ایک افسانہ نگار ہیں، ساتھ ہی سماجی اور ادبی کاموں میں پیش پیش رہنے والی ایک پر اعتماد شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب ڈاکٹر بھی ہیں۔ آپ کے اب تک کئی اردو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ساتھ ہی آپ کو کئی ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ انھیں سے ایک ملاقات جو ہماری یادوں میں زندہ رہے گی۔

میں ڈاکٹر مینا نقوی کے اس شعر پر اس گفتگو کا آغاز کرتی ہوں:

انتظار کے موسم ختم کیوں نہیں ہوتے
زندگی چراغوں کی لمحہ لمحہ مرتی ہے

س: آپ اپنی تعلیم کے بارے بتائیں کہ آپ نے کہاں کہاں سے تعلیم حاصل کی؟

ج: پیدائش نگینہ، ضلع بجنور، یوپی ہے۔ انٹرمیڈیٹ وہیں سے کیا۔ ہائر ایجوکیشن آگرہ یونیورسٹی، روہیل کھنڈ یونیورسٹی اور میڈیکل کانپور یونیورسٹی سے۔

س: تعلیم کے دوران آپ نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا ان میں سے کس کتاب سے سب سے زیادہ متاثر ہوئیں؟

ج: بچپن سے آج تک کتابوں اور اچھے لٹریچر کا ساتھ رہا ویسے تو جہاں تک کتابیں پڑھنے کا سوال ہے اثر سب کا ہے۔ ہاں پڑھنے کے دور میں کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ شروعاتی دور میں میر انیس کے مرثیے پڑھے اس کے بعد افسانے ساتھ ساتھ شیکسپیئر اور ہندی اردو کی کئی کتابیں بھی پڑھیں جن میں میر وغیرہ اہم ہیں۔

س: آپ نے اپنی زندگی میں جن شخصیات کو قریب سے دیکھا ان میں سے کس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئیں یا دوسرے لفظوں میں آپ کی پسندیدہ شخصیت کون ہیں؟

ج: مجھ پر سب سے زیادہ میرے والد صاحب کا اثر ہے وہ بیحد ادب نواز شخصیت تھے۔

س: تعلیم کے دوران اور تعلیم کے بعد مختلف تحریروں کو پڑھنے کے نتیجے میں آدمی مختلف افکار و نظریات جانتا اور سمجھتا ہے آپ کس فکری رجحان

سے متاثر ہیں؟

ج: معاشی اور اقتصادی تغیرات نے ادب میں جدید رجحانات کی آبیاری بخوبی کی، مخالفت میں دوسرا ادبی نظریہ یا رجحان پروان چڑھتا رہا لیکن جہاں تک میرا نظریہ ہے میں کسی ایک رجحان سے متاثر نہیں ہوں بلکہ انسانی جذبوں اور احساسات میرے قلم کو ضیا دیتے ہیں۔

س: آپ کا ادبی ذوق بہت بلند ہے آپ ہندی، انگریزی اور اردو ادب میں کن کن ادبا اور شعرا کو پسند کرتی ہیں؟

ج: بچپن سے آج تک کتابوں اور اچھے لٹریچر کا ساتھ رہا ہے۔ میر انیس، دبیر، میر غالب اور جگر سے لے کر پروین شاکر تک ہندی میں نرالا، مہادیوی ورما، انگریزی میں ولیم ورڈس ورتھ شیکسپیئر کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ میری شاعری میری اپنی ہے اس میں کسی کا عکس ہے ایسا مجھے نہیں لگتا ہے یا میں اس کو واضح نہیں کر پاتی۔

س: آپ نے جو کتابیں یا تحریریں لکھی ہیں ان میں سماجی مسائل کو زیادہ بیان کیا ہے یا اخلاقی بحران اور سیاسی زوال کو؟

ج: میں انسانی احساسات اور جذبوں کی شاعرہ اور ادیبہ ہوں جس پر سماجی مسائل اخلاقی بحران اور سیاسی زوال سب اثرانداز ہوتے ہیں۔

س: میدان سیاست میں یا حقوق کے میدان میں پرامن جدوجہد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ خاص طور پر جب خواتین اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑی ہوں؟

ج: خواتین کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ پرامن جدوجہد میں آگے رہیں۔ اپنی پہچان بنائیں ویسے حالات خوش کن ہیں۔ اور ہر قوم میں خواتین بیدار ہو رہی ہیں۔

س: جدید اردو میں یا جدید ہندی ادب میں اس وقت کون سے رجحانات زیادہ مصروف اور مقبول ہیں؟

ج: میں سمجھتی ہوں موجودہ حالات میں سیاست بہت حاوی ہے حالانکہ اچھا ادب بھی لکھا جا رہا ہے۔ جدیدیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے زندگی کو ایک مکمل اکائی کی طرح دیکھنے کا رجحان جدید ادب میں پایا جاتا ہے۔ ہر دور میں شاعری میں خارجی و داخلی رجحانات پائے جاتے ہیں۔

س: تعمیری ادب یا ترقی پسند ادب کس کو کہتے ہیں؟ اور اس وقت کے اردو ادب میں خواہ وہ شاعری ہو یا نثر نگاری کون سا رجحان زیادہ غالب ہے؟

ج: سیاسی پس منظر میں عصری رجحانات کو مرکزیت سے لامرکزیت کی طرف لایا جا رہا ہے۔ ادب میں بھی یہ خصوصیات آ رہی ہیں۔

س: ایک فنکار جب کچھ تخلیق کرتا ہے چاہے وہ کسی زبان میں ہو۔ خواہ وہ افسانہ ہو یا ڈرامہ یا ناول ہو یا مختصر قصہ اور کہانی ہو تو وہ اس میں اپنی زندگی کے تجربات یا اپنی نگاہ سے جن چیزوں کو وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے فنکار بیان کرتا ہے۔ آپ نے اس اعتبار سے کن مسائل کو یا کن پہلوؤں کو زیادہ اہم سمجھا اور ان پر زیادہ توجہ دی؟

ج: میں آپ کو بتا چکی ہوں میں بنیادی طور پر انسانی اور قدرتی اقدار و جذبات کی شاعرہ ہوں۔

س: آپ کی کتابوں کی اور تحریروں کی تعداد کتنی ہے؟ اور ان کو مقبولیت کن بنیادوں پر حاصل ہوئی۔ کیا سماج کے تمام طبقات میں ان کو مقبولیت ملی؟ یا صرف ادبی ذوق رکھنے والے حلقوں میں۔

ج: جی ہاں! میری 11 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ قاری نے میری کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ شاید اس کی وجہ میری آسان زبان اور متاثر کرنے والے مضامین ہیں۔ ان میں سے کچھ خاص کتابوں کا ذکر کرنا چاہوں گی جن میں 'سائبان'، 'بادبان'، 'درد پت جھڑ کا'، 'کرچیاں درد کی'، 'جاگتی آنکھیں'، 'دھوپ چھاؤں'، 'منزل' اور 'آئینہ' ہیں۔

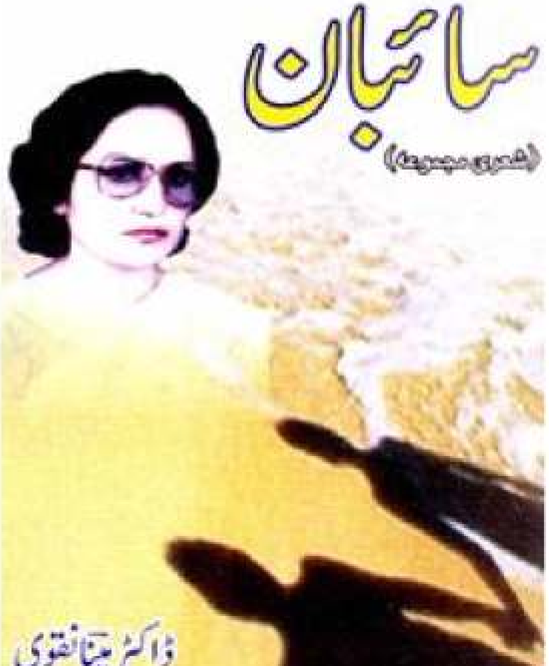

س: ہندوستان کے موجودہ سیاسی نشیب وفراز اور سماجی ہلچل کو آپ نے کس طرح دیکھا اور اسے اپنی تحریروں میں کس حد تک جگہ دی؟

ج: ادیب یا شاعر عصر حاضر سے متاثر نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں آج کل کے ہندوستان کے حالات نے تو ذہن کو متاثر کیا ہے آج کل جو لکھ رہی ہوں اس کا عکس کہیں نہ کہیں شاعری میں ضرور چھلک جاتا ہے۔

س: ہندوستان کی تمام زبانوں میں جو ادبا اور شعرا موجود ہیں ان کے باہمی تبادلۂ خیال اور ایک دوسرے سے استفادہ کی ملکی سطح پر کیا کوششیں کی گئی ہیں؟ اور اس کے کیا فائدے ہوئے ہیں؟

ج: انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے بہت آسانیاں فراہم کی ہیں ایک دوسرے سے رابطے ہوئے ہیں جو آج کل نئے لکھنے والے ہیں اور جو پرانے لکھنے والے ہیں وہ رابطے میں ہیں ان سے استفادہ کیا جاتا ہے میں سمجھتی ہوں کہ لکھنے والوں کے لیے اور پڑھنے والوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔

س: خواتین کے ادب اور بچوں کے ادب کے سلسلہ میں آپ نے کیا جدوجہد کی؟ اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

ج: میری شاعری کے مرکز میں خواتین ہی رہتی ہیں۔ ہاں بچوں کے ادب پر میرا کام بہت ہی کم ہے۔

س: کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فن کو اخلاقی ادب سے آزاد ہونا

چاہیے یعنی وہ کسی اخلاقیات کا پابند نہیں آپ کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے؟

ج: معذرت چاہتی ہوں میں تو اخلاقیات کے فیور میں ہوں اخلاقیات کے بغیر لکھنا بالکل بیہودہ بات ہے میں اخلاقیات کی پابندی کرتی ہوں۔

س: ہندوستان کی مختلف تحریکات میں خواہ وہ سیاسی ہو یا ادبی تعلیمی ہو یا سماجی خواتین نے بھی حصہ لیا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: بہت خوش آئند بات ہے کہ خواتین اب وقت کے ساتھ چل رہی ہیں اور ہر شعبہ میں اپنی حاضری درج کرا رہی ہیں۔

س: مذہبی کتابوں میں جو قصے ملتے ہیں ان کو اخلاقیات کی تعمیر کے لیے کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے؟ اور آپ کے خیال میں شخصیت کی تعمیر میں اس کو موثر و مفید بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

ج: یقیناً مذہب اخلاقیات ہی سکھاتا ہے اور جو بچہ اپنی ابتدائی عمر میں مذہب سے دور ہوتا ہے اس کی اخلاقیات کا بھی اللہ ہی حافظ ہوتا ہے کیونکہ مذہب ایک ضروری چیز ہے اس سے اسے الگ کرکے نہیں آنکا جا سکتا۔

س: موجودہ دور میں کتب بینی کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے اس کی کیا

وجوہات ہیں؟

ج: سب سے بڑی وجہ تو ہے آج کا انٹرنیٹ۔ اس انٹرنیٹ کے چکر میں کتابوں کے قارئین بہت کم ہو گئے ہیں۔ ہر چیز وہ گوگل پر ڈھونڈ لیتا ہے۔ کتاب پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ کیونکہ کتاب اپنی جگہ پر ہے اور جو کتاب سے ملتا ہے وہ ہمیں ابھی تک گوگل میں نہیں مل پاتا۔

س: انسانوں کا انسانیت کی بنیاد پر باہم جوڑنے کی اور ایک دوسرے کو مربوط کرنے کی کیا کیا شکلیں اور صورتیں ممکن ہیں؟

ج: میری نظر میں تو صرف ایک ہی چیز ممکن ہے محبت اور صرف محبت۔

س: ہندوستان کے موجودہ حالات کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے اور کیا جب امن وامان کی اور کشمکش کی فضا ہوگی تو اس میں کیا کوئی ادبی یا علمی کام ہو سکتا ہے؟

ج: جی میں نے کئی مضامین اس موضوع پر لکھے ہیں۔ نظمیں بھی لکھی ہیں مگر امن کی بحالی تو کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب امن ہوگا تبھی ہر چیز پر توجہ دی جائے گی۔ جب آدمی بحران کا شکار رہے تو وہ نہ پڑھ سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے۔ نہ گھر دیکھ سکتا ہے نہ نوکری کر سکتا ہے۔ مطلب کسی چیز سے وہ انصاف نہیں کر سکتا۔

س: ہندوستان میں ادھر گذشتہ برسوں میں جرائم اور خودکشی دونوں کے گراف میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کے کیا اسباب ہیں؟

ج: ہر آدمی آج کل کے حالات سے مجبور ہے وہ ذہنی طور پر پریشان ہے اور معاشی طور پر بہت کمزور ہے اس کے پاس نہ نوکری ہے اور نہ ہی وہ اپنی فیملی کا گزر بسر کر پاتا ہے اسی لیے خودکشی اور جرائم کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

س: ہندوستان میں لوگوں کے ذہنی دباؤ میں کافی اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نفسیات کے ماہرین کے یہاں لائن لگتی رہتی ہے۔ یہ دباؤ اور ڈپریشن لڑکے لڑکیوں اور عورتوں اور نوجوانوں میں بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کے کیا اسباب ہیں اور ان کو کیسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے؟

ج: دیکھئے! میں خود بھی ایک ڈاکٹر ہوں اور ڈاکٹر ہونے کے ناطے انسانی نفسیات کی بھی تھوڑی بہت جانکاری رکھتی ہوں۔ ملک میں یا گھر کے نزدیک کے محلے میں جو بھی حالات ہوتے ہیں اس سے ہر آدمی اثر انداز ہوتا ہے۔ آج کل ہر دوسرا آدمی ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ جب تک ذہنی سکون نہیں ہوگا تب تک آدمی کسی مرکز پر اپنا دھیان نہیں رکھ سکتا۔

س: آپ نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا مختلف مذہبی طبقات کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں اگر کچھ لکھا ہو تو اس کے بارے میں بتایئے۔

ج: ہاں! میں نے اس پر بہت مضامین لکھے ہیں اور کچھ شائع بھی ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جب مذہب کی بات آتی ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ اچھائیاں ضرور ہیں۔

□□□

Zaibunnisa
A-1, 4th Floor
M.M. Apartment
Okhla Vihar
Jamia Nagar
New Delhi-110025

ڈاکٹر شائقہ آفرین

شکیلہ اختر کے افسانوں میں عورت

کہا جاتا ہے کہ عورت خود قصہ ہے اور قصے کا موضوع بھی۔ عورت فطری طور پر قصہ گوئی سے شغف رکھتی ہے۔ قدرت کی طرف سے اسے افسانہ طرازی کا ملکہ عطا کیا گیا ہے۔ سماجی تبدیلی اور تعلیم کے فروغ نے عورتوں کو مردوں سے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کا موقع دیا۔ پہلے زندگی کے بہت سے شعبوں میں عورتیں مردوں کے مقابلے میں بہت پیچھے تھیں۔ اب زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ عورتیں ہر اصناف ادب میں طبع آزمائی بھی کرنے لگیں ہیں۔ اردو فکشن میں تو وہ کئی دفعہ مردوں سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ عورتوں نے عورتوں کے غلط رسم و رواج، اندھی عقیدت، جہیز کے لین دین اور جہالت کے خلاف اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ آواز اٹھائی ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃالعین حیدر، واجدہ تبسم، شمیم نکہت، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، صدیقہ بیگم، رضیہ سجاد ظہیر، قیصر جہاں اور لیلیٰ لکھنوی وغیرہ کے نام بے حد اہم ہیں۔ ان لوگوں نے دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کے ذریعہ اٹھایا۔

بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے نہ صرف خود افسانہ نگاری کی بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے افسانہ نگاری کی راہیں بھی ہموار کیں۔ آج ان کے نقوش قدم پر بہار کی بہت ساری افسانہ نگار چل کر اپنا نام روشن کر رہی ہیں۔ اعجاز شاہین، نصرت آرا، ذکیہ مشہدی، ڈاکٹر قمر جہاں، شمیم صادقہ، عصمت آرا، شیریں نیازی اور صبوحی طارق وغیرہ بہار کی اہم ترین افسانہ نگار ہیں۔ ان لوگوں نے خواتین کے مسائل کو اٹھایا ہے۔

شکیلہ اختر نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں خواتین کے مسائل کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورتوں کی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف تھیں اس لیے عورتوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کرداروں کے حرکات و سکنات کو فطری انداز میں آگے بڑھاتی ہیں۔ ان کے افسانے نسوانی کرداروں کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اونچی سوسائٹی سے لے کر نچلے طبقے کے کردار بھی بالکل حقیقی انداز میں ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ہر عمر کے اور ہر ماحول کے کرداروں کو پیش کرتی ہیں۔ ان کا لب و لہجہ بالکل فطری ہوتا ہے۔ عورتوں کے محاورے اور ان کے مخصوص لب و لہجے کو شکیلہ اختر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ بالکل حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

شکیلہ اختر نے اپنے افسانوں میں فرسودہ رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھائی ہے، ساتھ ہی ان بوڑھے بزرگوں کے خلاف بھی جو لڑکیوں اور عورتوں پر بے جا پابندیاں عائد کرتے ہیں اور ان پر اپنی مرضی لادنا چاہتے ہیں۔

شکیلہ اختر نے اپنے افسانہ ''سہاگ'' میں نسوانی کردار کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں بے جوڑ شادی کو دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں شکیلہ اختر نے بچپن کی شادی کے برے اثرات کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ''وہ دونوں وقت خود چولھا جلاتا۔ اس کی بڑی بیٹی کچھ مدد کرتی۔ وہ جیسے تیسے کچا پکا کھانا دیا کرتا۔ صغریٰ اور کبریٰ دونوں بہنیں اپنے اندھے باپ کے ساتھ گنجان بستی کے اندر بڑھتی گئی۔ ان کے سروں پر اب چھوٹے چھوٹے دوپٹے ڈال دیے گئے تھے۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے مل کر بڑے پیار اور محبت کے ساتھ رہتیں۔'' (سہاگ)

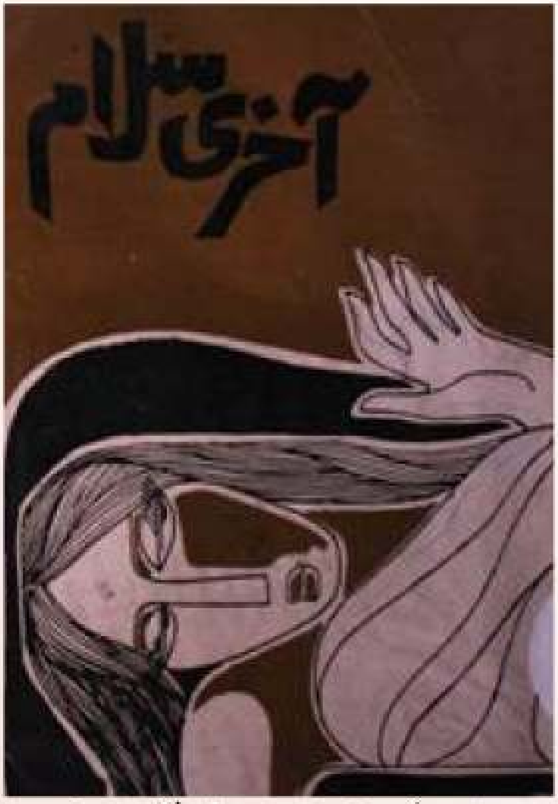

''سیندور کی ڈبیہ'' میں مصنفہ نے دو نسوانی کرداروں کے ذریعہ ہسپتال کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ دونوں کردار کیتھرائن اور ڈولی کے ذریعہ عورتوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مشرقی اور مغربی فلسفے کو پیش کرنے میں دونوں کردار کامیاب ہیں۔

عورتوں کی نفسیات کو شکیلہ اختر نے کئی افسانوں میں نسوانی کردار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

''فیس پاؤڈر'' کی بیگم صاحبہ کے ذریعہ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورتوں کے لیے بننا سنورنا کتنی اہم چیز ہو گئی ہے۔ عورتیں اس کے بغیر اپنے آپ کو ادھوری سمجھتی ہیں۔

''چائے کی کلھیا'' میں عورتوں کی جنسی نفسیات کے تعلق سے باتیں کی گئی ہیں۔ مصنفہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر کسی لڑکی کی شادی تیس سال کی عمر تک نہیں ہوتی تو اس کی جنسی خواہشات مردہ ہونے لگتی ہیں اور وہ امیدی اور ناامیدی کے بھنور میں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہے۔ ششما کے کردار کے ذریعہ یہ دکھایا گیا ہے کہ لاکھوں ایسی لڑکیاں ہیں جو خوبصورت نہ ہونے اور جہیز نہ دے سکنے کی پاداش میں اس منزل سے گزر رہی ہیں۔

خواتین کے کردار میں شکیلہ اختر نے کئی اچھے افسانے لکھے جو خاص و عام میں مقبول ہوئے۔ ان میں ''آنکھ مچولی''، ''ٹوٹی ہوئی گڑیا''، ''راگنی'' اور ''ایک عجیب سی لڑکی'' وغیرہ بے حد اہم ہیں۔ ان افسانوں میں خواتین کے کردار میں خواتین کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔

''اعتراف'' کی ''شاہینہ'' اور شہنا'' کی شہنا کے ذریعہ محبت کی تڑپ کو دکھایا گیا ہے۔ کچھ لڑکیاں اپنے چاہنے والوں سے محبت کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتی ہیں کیونکہ ان کے اندر مشرقی خون اور مشرقی ماحول رچا بسا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کھل کر اظہار نہ کرنے کی وجہ سے سامنے والے کو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا خمیازہ لڑکی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

شکیلہ اختر نے طوائف کو موضوع بنا کر بھی کئی افسانے لکھے ہیں۔ ان میں ''تلاش منزل'' کو اولیت حاصل ہے۔ سلمیٰ طوائف بن کر کملیش ہو جاتی ہے۔ جب اس کا دل اکتا جاتا ہے تو وہ گھر لوٹنا چاہتی ہے لیکن اس کے گھر کے مرد اسے ایسا کرنے نہیں دیتے۔ عورتیں بھی اسے گھر میں رہنے دینا نہیں چاہتیں کیونکہ مرد اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ گویا عورتیں آج بھی مرد ہی کے اشارے پر کام کرتی ہیں۔ اس افسانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی کوئی عورت اگر کھائی میں گر جاتی ہے تو اس کے چاہنے کے باوجود اسے اس کھائی سے نکالنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔

''سویا ہوا خدا'' میں افسانہ نگار نے سوتیلی ماں کے کردار کو پیش کیا ہے۔ آج کے ماڈرن اور جدید دور میں لوگ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دولت ہی اس کے لیے عصمت ہے۔ ممتا اور محبت سب پیسے کے آگے کمزور ہے۔ اسی موضوع پر شکیلہ اختر کا ایک افسانہ ''آنکھ مچولی'' ہے جو بے حد مقبول ہو چکا ہے۔ اس افسانے کی نسوانی کردار پروین ہے۔ اسے کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے وہ پڑوس کے بچے سے

بے انتہا پیار کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر اس کی ممتا جاگ جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ بھول جاتی ہے کہ وہ اس کا بچہ نہیں ہے۔

رادھا ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو جہیز کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ''آخری سلام'' کا یہ کردار ادبی حلقے میں کافی مقبول ہو چکا ہے۔ رادھا کی شادی ہونے والی تھی لیکن لمبے جہیز کی مانگ کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو پاتی ہے۔ لمبے جہیز مانگنے کی وجہ سے وہ خود شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کی شادی نہیں ہو پاتی ہے اور اس کی ساری تمنائیں خاک میں مل جاتی ہیں۔

افسانہ ''ڈائن'' کی مھوائن کا کردار بھی غریبی اور بدصورتی کی لعنت کو پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں دکھایا ہے کہ امیر اور زمیندار کس طرح غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔

''کچے دھاگے'' میں ڈومنی کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جسے لوگ حقیر اور کمتر سمجھتے ہیں۔ مصنفہ نے اس افسانے میں ڈومنی کے شوہر کی موت کے بعد کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ان کی اعلیٰ فنکاری کا پتہ چلتا ہے، مصنفہ عورتوں خاص طور سے دلت اور مزدور عورتوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی درجہ بندی کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔

''بن تجلی'' کی نیلوفر نام کی مرکزی کردار کے ذریعہ شکیلہ اختر یہ دکھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ عورتوں کی آزادی پر سماج کی پابندیاں ٹھیک نہیں ہیں۔ انھیں اپنی مرضی سے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔

''رادھا ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو جہیز کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ''آخری سلام'' کا یہ کردار ادبی حلقے میں کافی مقبول ہو چکا ہے۔ رادھا کی شادی ہونے والی تھی لیکن لمبے جہیز کی مانگ کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو پاتی ہے۔ لمبے جہیز مانگنے کی وجہ سے وہ خود شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کی شادی نہیں ہو پاتی ہے اور اس کی ساری تمنائیں خاک میں مل جاتی ہیں۔''

''گریز'' شہری اور دیہی دونوں زندگیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس افسانے کی نسوانی کردار عیش شہر میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ دیہات میں جا کر وہاں کے حالات کو ٹھیک کرنا چاہتی ہے تو زمیندار طبقہ عینی کی مخالفت کرنے لگتا ہے۔

''ٹھنڈی آگ'' بھی شکیلہ اختر کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس کی نسوانی کردار کو ایک دلہن کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا شوہر ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور ماڈرن بھی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی خواہشات کا خیال نہیں رکھ سکتا ہے۔ دلہن کی جنسی اور ذہنی تپش قائم رہ جاتی ہے اور وہ گھٹ گھٹ کر زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شکیلہ اختر نے اپنے بیشتر افسانوں میں نسوانی کردار ہی کو پیش کیا ہے۔ کہیں مرکزی کردار کی صورت میں اور کہیں ضمنی کردار کے طور پر۔ وہ اردو کی ایک مایہ ناز افسانہ نگار تھیں۔ اردو دنیا انھیں ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

□□□

Dr. Shaika Afrin
Govt. Urdu Middle School Nazra
Post Meghwan, Via- Benipatty
Dist- Madhubani-847102 (Bihar)

شاعرات کے منتخب اشعار

آپ کی بے التفاتی سے شکایت تھی مجھے
جب محبت سے ملے سارا گلہ جاتا رہا

میں نے پوچھا کہ کبھی ربط بھی تھا ہم سے تجھے
کس رکھائی سے کہا اس نے 'مجھے یاد نہیں'

صالحہ بیگم مخفی

نگاہ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرہ ذرہ محبت کا رازداں ہو جائے

زباں سے کیجیے رسوائے نالہ کیوں اس کو
وہ راز آنکھوں ہی آنکھوں میں جو بیاں ہو جائے

حیا لکھنوی

مجھے گماں نہ ہوا ان کی بے نیازی کا
کچھ اس ادا سے وہ بے گانہ وار گزرے ہیں

ٹھہرائے باد خزاں ایک نفس کی مہلت
رنگ گلشن کو ابھی اور نکھر جانے دو

صفیہ شمیم

ادھر منتظر ہیں لگی در پہ آنکھیں
ادھر ان کو آنے کی فرصت نہیں ہے

بہت التجا سے گیا نامہ بر تھا
کہا، خط کتابت کی عادت نہیں ہے

رابعہ سلطانہ ناشاد

زخم جاں سوز جگر، اشک فسانی مانگے
دل طلب گار فسانہ ہے کہانی مانگے

ہے کوئی شخص جو گم تشنہ جوانی مانگے
قصر تعمیر کرے یوسف ثانی مانگی

سعیدہ عروج مظہر

گو خوف سے عذاب کے لرزی ہوئی تھی میں
لیکن ترے کرم کو بھی پہنچاتی تھی میں

مرتی تھی بار بار گناہوں کے ڈر سے میں
زندہ ہوں اس لیے کہ تجھے سوچتی تھی میں

بیگم رضیہ حلیم جنگ

در بھی نہیں تھا کوئی دریچے بھی بند تھے
آنکھوں میں جانے کیسی دھنک تھی رچی ہوئی

دیر آشنا کلیاں کس سے حال دل کہتیں
وہ تو بے خبر گزرا جس کی راہ دیکھی تھی

ادا جعفری

پھینکی تو ہیں ہم نے بھی ستاروں پہ کمندیں
پرواز ابھی اپنی لب بام نہیں ہے

یوں ہر قدم پہ ٹھوکریں ملتی رہیں مگر
ہم زندگی کو خراب پریشاں نہ کر سکے

زبیدہ تحسین

ڈاکٹر افسانہ حیات

اردو شاعری میں قومی ہم آہنگی کی روایت اور اقبال

ہندوستان اور اردو شاعری کی فضا میں قومی ہم آہنگی، آپسی اتحاد اور بھائی چارے کی روایت پختہ اور قدیم تر ہے۔ جس کے ابتدائی نقوش صوفی سنتوں کے علاوہ سلاطین کے یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اشوک نے ہندوستان میں جس قومی ہم آہنگی کی بنیاد قائم کی تھی بعد میں اس سلسلے کو مغل سلاطین خلجی، شیر شاہ سوری، ہمایوں، بابر اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کے عظیم الشان بادشاہ اکبرِ اعظم نے اس روایت کو وہ بلندی عطا کی کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان میں دو بڑی اکثریت ہندو اور مسلم ہیں جن کو ایک دھاگے میں باندھنے کے لیے صوفی سنتوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بھگتی تحریک کے حوالے سے قومی ہم آہنگی کے موضوع پر گفتگو کریں تو 15 ویں صدی عیسویں میں ہندی بھاشا کے کوی کبیر داس نے اپنی شاعری میں قومی ہم آہنگی اور بھائی چارے کی ایسی بامعنی تصویر پیش کی کہ اس کی معنویت آج سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد بھی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب عوام میں مذہب کی بنیادی باتوں کا شعور بھی پختہ نہ تھا کبیر نے مذہب کی ظاہری رسومات کے برخلاف مذہب انسانیت، آپسی اتحاد اور بھائی چارے کو اپنا پیغام اور مقصد بنایا۔ جس میں کبیر نے ہندو اور اسلام دونوں مذہب کی ظاہری رسومات کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے عمل و اعمال کا پیغام دیا جس میں مذہب کی کسی تفریق کے برخلاف حیاتیاتی امور کو ترجیح دی۔ کبیر نے اپنے دوہوں میں دونوں مذہب کی ظاہری رسومات کو تنقید کا نشانا بنایا:

کانکر، پاتھر، جوڑ کے مسجد لیے بنائے
پاتھر پوجے ہری ملے، تو میں پوجوں پہاڑ
تا چڑھی ملا بانگ دے کیا بہرا ہوا خدائے
تا تے تو چاکی بھلی، پیس کھائے سنسار

انسان دوستی اور بھائی چارے کی روایت کو گیارہویں اور بارہویں صدی میں صوفیائے کرام کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ چشتیہ سلسلے کے بانی خواجہ معین الدین چشتی نے اپنی تعلیمات کو انسانیت اور اور اس کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔ چشتیہ سلسلے کے اس کارواں کو آگے بڑھانے میں قطب الدین بختیار کاکی اور بابا فرید شکر گنج نے بھی اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے گیت ہی نہیں گائے بلکہ بلاتعصب تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا درس دیا۔ قومی ہم آہنگی کی اس روایت میں، صوفی سنتوں اور سلاطین کے علاوہ بطور خاص ہمارے اردو شعرا نے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا۔

اردو شاعری کی روایت میں قومی ہم آہنگی کے ابتدائی نقوش 16 ویں صدی عیسویں میں اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں۔ قومی ہم آہنگی کی بنیاد جن عناصر پر قائم ہے ان میں اپنے ہم وطنوں کی بھلائی، آپسی اتحاد، محبت، انسان دوستی ایک دوسرے

کے مذہب، تہذیب وثقافت کی عزت واحترام اور بنی نوانسان کی مشترقہ ترقی کا تصور سرِ فہرست ہے جسے اردو شعرانے بخوبی برتا ہی نہیں بلکہ اسے بڑھ چڑھ کر اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ قلی قطب شاہ وطن پرستی، انسان دوستی اور قومی ہم آہنگی کا بڑا احترام کرتا تھا، وہ غریبوں اور مجبوروں کا ہمدرد تھا۔ ممتاز علی آرٹسٹ اپنے مضمون میں قلی قطب شاہ کے عہد میں دکن میں ہندو مسلم اتحاد کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قلی قطب شاہ کا دورِ حکمرانی ہندو مسلم اتحاد کی قدروں کو پیش کرتا ہے تاکہ حیدرآباد کی سرزمیں سے فرقہ وارانہ ذہنیت ختم ہوجائے اور زندگی کی حقیقی قدریں ملک کو سنوار سکیں۔ یہ اتحاد کا پیغام سارے ہندوستان کے لیے دعوتِ عمل دیتا ہے اور دکن کے مشترکہ تمدن میں مشترکہ تہذیب اپنے مشترکہ نظام کی گواہ ہوسکے گی۔ (رسالہ شاہکار، 24 جنوری 1958)

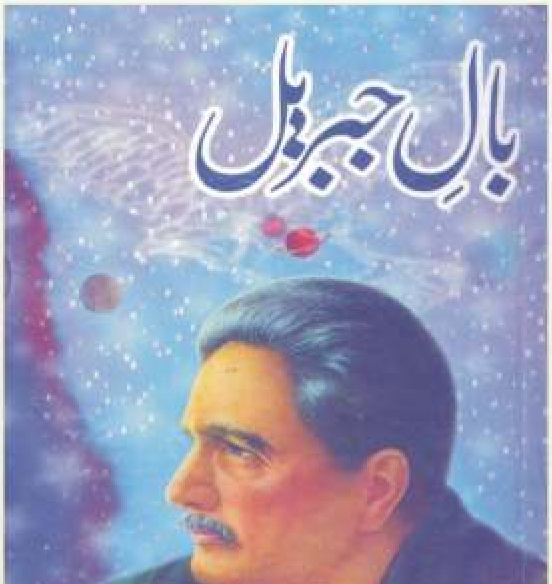

قطب شاہ انسان دوستی اور قومی ہم آہنگی کا علم بردار شاعر تھا۔ اس نے ہندوستانی تہذیب، رسم ورواج، موسم وتہوار، ہندو دیوی دیوتاؤں جیسے موضوعات کو اپنی شاعری کے دھاگے میں پروکر وطنیت اور ہندو مسلم اتحاد کی حسین تصویر پیش کی۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی میں ولی دکنی اور خدائے سخن کہے جانے والے میر تقی میر کے علاوہ تصوف کے یکتہ شاعر درد نے بھی قومی ہم آہنگی کے ان موضوعات، جن کا بنیادی جز انسانیت اور بھائی چارہ ہے کو حسن وجمالیات کے ساتھ غزل کے قالب میں ڈھال کر یوں پیش کیا کہ غزل اور قومی اتحاد تمام ظاہری رسومات سے بالاتر ہوکر صرف اور صرف احترامِ انسانیت اور انسان دوستی کا درس دیتے نظر آئے میر کا یہ قطعہ دیکھئے:

میر کے دین ومذہب کو کیا پوچھتے ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس باشندے نے، سب کو یہیں سے سلام کیا

اٹھارویں صدی میں آپسی اتحاد اور بھائی چارے کی اس روایت کو غزل اور نظم کے علاوہ شاعری کی دیگر اصناف قصیدہ اور مثنوی میں بھی ہندو اور مسلم شعرانے بڑے وقار اور احترام کے ساتھ پیش کیا۔ مثنوی میں دیا شنکر نسیم، قصیدہ میں سودا اور بعد میں محسن کاکوروی وغیرہ نے مذہبی رواداری کے چمن کو شاد وآباد کیا۔ محسن کاکوروی کے ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سمت کاشی سے چلا، جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سروقدانِ گوکل
جاکے جمنا پہ نہانہ بھی ہے ایک طولِ امل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی نے اردو شاعری کو زلف ورخسار کے پیچ وخم سے نکال کر زمین اور زمینی سطح سے جڑے مسائل وموضوعات کو بالکل عام فہم اور سادہ زبان میں خالص ہندوستانی تہذیب اور اصل ہندوستانیت کو پیش کیا۔ جس میں ہندوستانی تقریبات، تہوار، رسم ورواج معمولی واقعات وموضوعات کوئل، بلبل، ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، عید، ہولی دوالی، بنجارہ نامہ، ککڑی والا، خوانچے والا، جیسے عوامی موضوعات کے علاوہ ہندو مذہب کے دیوی، دیوتاؤں شیوجی، کرشن جی وغیرہ پر ایسی متعدد نظمیں کہیں ہیں جو قومی ہم آہنگی کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ نظیر نے اپنی شاعری میں مذہبی رواداری کی فضا کو عام کرکے تعصب اور فرقہ واریت کو مٹانے پر بڑا زور صرف کیا ہے۔ انھوں نے مذہب وملت سے بالاتر ہوکر

خدا کی مخلوق سے محبت ورواداری کو قلندری سے تعبیر کیا ہے:

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آل
زنّار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآن
عاشق تو قلندر ہے ، ہندو نہ مسلمان

آج اردو ادب اور انیسویں صدی کے سب سے اہم اور عالمی سطح پر شہرت یافتہ شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب جنھوں نے اردو شاعری کو دل کی راہوں سے ذہن تک کا سفر کرایا۔ مذہب وملّت کی تفریق سے بالاتر ہو کر اسلام اور کفر کی حدود کو مٹا کر یکجا کرتے نظر آتے ہیں:

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

انیسویں صدی کے اواخر میں حالی اور محمد حسین آزاد کے یہاں اس روایت کی پختگی کے ثبوت ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری سے بڑا اہم اور مثبت پہلو تلاش کر شاعری کو زندگی کے حقائق سے روبرو کرایا۔ اس زمانے میں پورے ہندوستان کے اقوام 1857 کی ناکام جنگ کے نتائج میں بری طرح سلگ رہے تھے۔ ایسے حالات میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے اپنی شاعری سے ہندوستان کی آزادی، مذہبی رواداری اور یگانگت کے گیت گاتے ہوئے وطن سے محبت کے ساتھ تمام اقوام کو محبت واخوت کی ڈور میں باندھنے کی سعی کی ان کے یہاں مذہب اور خدا سے رشتہ بھی انسان اور انسان دوستی کی راہوں ہی سے ہو کر گزرتا ہے۔ حالی انسان دوستی کے بڑے قائل تھے۔ انسان کا انسان کے کام آنے ہی کو وہ اصل عبادت اور خدا کا دوست تصور کرتے ہیں:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسروں کا
خلائق سے ہو جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

ہندوستان کی آزادی کا راز بھی حالی کو فقط تمام مذاہب کے آپسی اتحاد اور میل ملاپ ہی میں پوشیدہ نظر آتا ہے۔ وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے تمام اقوام کو ایک کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلماں اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہو یا کہ ہو حنفی
جین مت ہو یا کہ ہو بشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھ کی پتلیاں سب کو

قومی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کی بڑی روشن اور عمدہ روایت ہمیں انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ملتی ہے۔ اس صدی میں کئی ایسے شاعر منظرِ عام پر آئے جن کی شاعری نے ہندوستان میں ایک انقلابی لہر دوڑادی۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ درپیش تھا ان شعرا نے آزادی کے جذبے کو ابھارنے کے لیے قومی ہم آہنگی اور انسان دوستی کا پیغام دیا۔ جس میں ان تمام شعرا جن میں بیسویں صدی کے سب سے اہم شاعر علامہ اقبال کے ساتھ ان کے معاصرین نے بھی تمام اقوام کو ایک ہی تسبیح کے دھاگے میں پرونے کی سعی کی ہے۔ ان شعرا میں چکبست، تلوک چند محروم، ظفر علی خاں، سرور جہاں آبادی، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، اسماعیل میرٹھی، آنند نرائن ملا وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا نے جہاں وطن کی آزادی اور وطن سے محبت وعقیدت کا اظہار کیا وہیں مذہبی رواداری اور آپسی میل ملاپ کے گیت بھی گائے۔ اس عہد میں ان تمام شعرا میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر نام اور کام علامہ اقبال کا ہے۔ جن کے یہاں وطن کی محبت میں عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کو خاکِ وطن کے ہر ذرّے میں دیوتا ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے وطن کی محبت اور آپسی اتحاد کے درمیاں مذہب کی دیواروں کو آڑے نہیں آنے دیا وہ کہتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

اقبال کے تصورِ اتحاد یا سیکولرزم کی وضاحت پروفیسر توقیر احمد خان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اقبال کی تو شاعری کی ابتدا ہی سیکولرزم سے ہوئی۔ ہمارے خیال میں احترامِ آدمیت سیکولرزم ہے یعنی ایک ایسا نظریہ جس کے مطابق تمام مذاہب کے لوگوں کے جذبات کا احترام کیا جائے اور تمام مذاہب کی تہذیب وتمدّن کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ بلاتفریق مذہب وملّت انسانوں کی دلجوئی کی جائے۔ اگر یہی سب کچھ سیکولرزم ہے تو

اقبال اردو شاعری میں سیکولرزم کے بانیوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔اقبال نے ابتدا ہی سے اپنی شاعری میں قومی تفریق کو دور کرنے کی بے حد کوشش کی ۔وہ ہندوستان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بلقصد اور بلاارادہ قوموں کے دلوں کو جوڑنے کی سعی کی اور اس کو باقاعدہ ایک پیغام اور مہم کی صورت عطا کی ۔جس نے آگے چل کر ایک سماجی سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر لی“

(غبارِ از جہانِ اقبال، پروفیسر توقیر احمد خان، ص177)

آپسی اتحاد، انسان دوستی، تمام مذاہب کا احترام اقبال کے یہاں سب سے بڑھ کر ہے ۔ان کی شاعری کی متنوع جہات کے باوجود ان کا مقام ایک قومی شاعر کی حیثیت سے بلند و بالا ہے ۔جہاں ان کی شاعری میں وطن کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے وہیں اس کی موجوں میں تمام مذاہب کا احترام اور ان مذاہب کی عظیم ہستیوں کا ذکر بھی بڑے احترام سے ملتا ہے۔

اقبال کی پوری شاعری میں انسان دوستی اور احترامِ آدمیت کا مقام سب سے بلند و بالا ہے۔اقبال نے اپنی شاعری کے اولیں ادوار ہی سے قومی ہم آہنگی کی ایسی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں، جو اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ ہندوستانی شاعری کی روایت میں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں ۔اقبال کی پوری شاعری محبت و اخوت کا پیغام ہے وہ ہر دکھ کا علاج صرف اور صرف محبت ہی میں تلاش کرتے ہیں:

محبت ہی سے پائی شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے
کعبے میں بت کدے میں یکساں تری ضیا ہے
میں امتیاز دیر و حرم میں پھنسا ہوں

اقبال نے اپنی شاعری میں ابتدا تا آخیر مذہبی، ذاتی اور نسلی امتیازات کی پرزور مخالفت کی ہے انھوں نے کسی مذہب کو دوسرے پر کبھی فوقیت نہیں دی ان کے پیشِ نظر انسان دوستی اور احترامِ آدمیت ہی اولین سرمایا ہے ۔اقبال کی مذہبی رواداری کا یہ عالم ہے کے وہ ہندوستان کی سرزمین پر ایک ایسا شوالہ بنانے کا خواب دیکھتے ہیں جہاں محبت ہی دین و ایمان ہے ۔اقبال کی مشہور زمانہ نظم ”نیا شوالہ“ ان کی اسی محبت کا پختہ ثبوت ہے:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دے، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اسی طرح اقبال کی کی نظم ”رام“ بھی مذہبی رواداری اور احترامِ آدمیت کی ایسی ہی عمدہ مثال ہے۔جس میں اقبال ہندو مذہب کے عظیم الشان شخصیت سری رام چندر جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جوشِ عقیدت میں انھیں امامِ ہند کہہ کر متعارف کراتے ہیں ۔ان کے اعلیٰ اوصاف کا اس قدر فخریہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اقبال کو فرقہ پرست یا مسلمانوں کا شاعر کہہ کر ان کے اثر کو محدود کرنے والوں کی تنگ نظری کا بڑا معصوم اور بامعنی جواب ہے۔نظم ”رام“ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

1905 کے بعد اقبال وطنیت سے بین الاقوامی سفر کی جانب گامزن ہوئے اور انھوں نے ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا“ کے بعد ”مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا“ کہا۔ اقبال نے یورپ میں قیام کے دوران مغرب میں وطنیت کے نام پر جو خوں ریزی کا بھیانک چہرا دیکھا اس نے اقبال کو وطنیت کے محدود دائرے سے نکال کر بین الاقوامی نظریہ کا حامل بنا دیا۔ جو اسلام کا بھی نظریہ تھا اس کے تحت محدود وطنیت کے برخلاف زمان و مکان سے بالاتر ہو کر تمام بنی نوع انسان کی محبت ،اخوت اور انسانی احترام کا پیغام دیتے ہیں۔اسی لیے وہ تمام سرحدوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں:

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اقبال نے بنا کسی نسلی یا جغرافیائی تفریق کے تمام بنی نوع انسان کی برابری، فلاح و بہبود کا پیغام دیا ہے، جس میں وہ کسی بھی انسان کی حق تلفی کو سخت گناہ تصور کرتے ہیں ’عظمتِ انسان‘‘ میں قدیر امتیاز اقبال کے ان اوصاف کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اقبال کے یہاں انسانیت کا تصور وسیع اور بلیغ ہے اس تصور میں انسانی احترام، انسان دوستی، انسانی ہمدردی، انسانی آزادی اور بنی نوع انسان سے انس ہی نہیں بلکہ انسان کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی عظمت کا پہلو بھی نمایاں ہے اس قبال کا فلسفہ خیر و شر، فلسفہ حرکت و عمل اور مسلہ جبر و اختیار کا منشا ہی انسانی عظمت کا استحکام اور انسانیت کی بقا ہے“

(قدیر امتیاز، اقبال اور عظمتِ آدم، ص 77)

اقبال کو سنسکرت زبان سے بڑی محبت تھی۔انھوں نے گہرائی سے ویدوں کا مطالعہ کیا۔ ہندو مذہب کے مقدس گایتری منتر کا ترجمہ ” نظمِ آفتاب“ کے عنوان سے کیا۔اسی طرح ہندو مذہب کی عظیم شخصیات کی بھی بے جھجک مدح سرائی اور ان بلند اوصاف کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا ہے۔اقبال نے جہاں ہندو مذہب کی عظیم شخصیات پر نظمیں کہیں دوسرے مذاہب سکھ اور بودھ مذہب کے رہنماؤں کو عقیدت اور ہند میں ان کی بے قدری پر دل برداشتہ بھی ہوئے۔ بدھ مذہب کے بانی گوتم بدھ نے ہندوستان میں محبت واخوت اور زندگی کا فلسفہ دیا مگر ہندوستانیوں نے ان کو وہ مقام نہ دیا جو ان کا جائز حق تھا۔لہٰذا اقبال ان کی ناقدری سے رنجیدہ ہونے کے باوجود ایک بار پھر پنجاب میں اس قومی رہنما نانک کی آمد جس میں ایک بار پھر ہندوستان کو خوابِ غفلت سے جگا کر وحدت کا گیت گانے والے رہنما سے متاثر ہو کر جوشِ اظہار میں انھیں مردِ کامل کہ اٹھتے ہیں:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروانہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ
آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پہ ناز تھا
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار سے
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اقبال نے شاعری میں تمام مذاہب کا احترام جس فراخدلی سے کیا وہ اپنے آپ میں ایک جداگانہ مثال ہے۔مگر انھوں نے ان جذبات کو صرف شاعری تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی بڑی صداقت اور ایمانداری کے ساتھ نبھایا۔اقبال زندگی بھر مذہبی رواداری اور آپسی اتحاد کے لیے کوشاں رہے ہیں۔لہٰذا ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری اور اردو زبان کا مزاج اور فکر انھیں سیکولر عناصر پر قائم ہے جن میں ایک دوسرے کے مذہب، تہذیب و تمدن اور سب سے بڑھ کر احترامِ آدمیت کو اہمیت حاصل ہے۔جسے ہر عہد اور ہر زمانے میں اردو شعرا نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور خوب صداقت و ایمانداری سے نبھایا جو کہ اس کا جائز حق تھا۔لہٰذا ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ تمام عالم کو آج انھیں جذبات و احساسات اور پیغام کی ضرورت ہے جنھیں ہمارے شاعر اور ادیبوں نے ہر دور میں پیش کیا ہے۔

□□□

Dr. Afsana Hayat
B.2 506
S.R.S Residency
Sector 88
Faridabad-121002 (Haryana)

صبیحہ نسرین

جگر مرادآبادی

کی شخصیت کے اہم نقوش

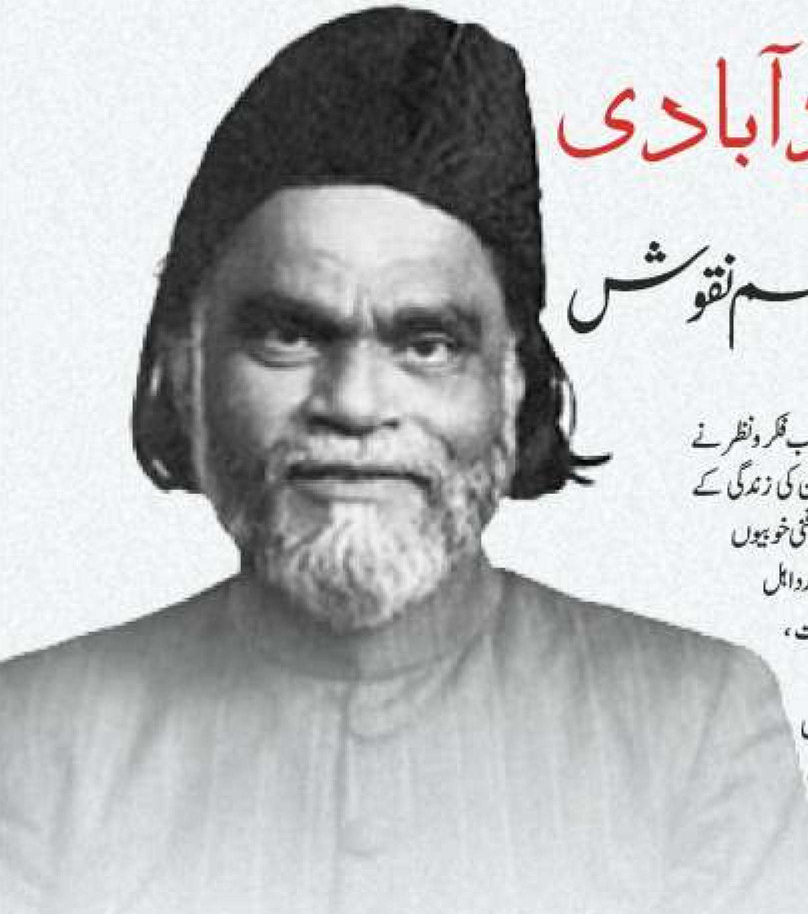

جگر مرادآبادی کی شخصیت اور فن کے متعلق ارباب فکر ونظر نے مختلف زاویوں سے بحث کی ہے۔ سوانح نگاروں نے ان کی زندگی کے واقعات اور حوادث پر روشنی ڈالی ہے۔ ناقدین نے ان کی فنی خوبیوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی متعدد اہل علم وفضل اور اصحاب ادب وسیاست نے جگر کی فنی عظمت، شخصی کمالات اور ذاتی کمزوریوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

بلاشبہ جگر مرادآبادی کی دلآویز شخصیت، کردار کی بلندی، سیرت کی بوقلمونی اور ان کی شاعری کی جذب آفرینی ووارفتگی، نغمگی اور سوزمندی نے لاکھوں دلوں کو مسحور ومسخر کیا ہے۔

جگر کی اس تہہ دار اور کثیر الابعاد شخصیت اور ان کی سیرت وکردار کی تشکیل میں کارفرما عوامل کی تلاش وجستجو میں سوانح نگار اور ناقدین شعروادب نے کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ظاہر ہے سوانح نگاری اور تنقید نگاری کی محدود دنیا میں ''شخصیت'' کی جلوہ نگاری اتنی دلچسپ اور کامیاب نہیں کہی جاسکتی۔ اردو ادب میں خاکہ ایک ایسی صنف ہے جو فرد کی سیرت وکردار، نفسیات اور رویے کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح منعکس کرتی ہے کہ شخصیت اپنی پوری آب وتاب اور خوبی وخامی کے ساتھ نظر آنے لگتی ہے۔

اردو کے قارئین خوش قسمت ہیں کہ مختلف اصحاب علم وبصیرت نے جگر مرادآبادی کی شخصیت کو اپنے فکر وتخیل کا موضوع بنایا ہے۔ ان میں رشید احمد صدیقی، محمد طفیل، مالک رام، علی جواد زیدی، شاہد احمد دہلوی، ماہر القادری، مظہر امام، نظیر صدیقی، محمد لطف اللہ خاں، کشمیری لال ذاکر، رئیس احمد جعفری، شوکت تھانوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہم نے اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ درج بالا خاکہ نگاروں نے جگر مرادآبادی کی زندگی کو کس انداز سے دکھایا ہے۔

کسی بھی انسان کی شخصیت سازی میں اس کی تربیت اور گردوپیش کے حالات وواقعات کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جگر کی شخصیت کی تعمیر بھی انھیں حالات وحادثات کے زیر اثر ہوتی ہے۔ جگر نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جہاں سماجی، تعلیمی، مذہبی غرض ہر اعتبار سے زندگی کی قدیم قدروں کا عزت واحترام پہلے سے موجود تھا۔ بچپن اور شباب کا زمانہ تنگ دستی میں گذرا لیکن انھوں نے اپنے آس پاس کے ماحول سے خودداری، محنت،

انسانی درمندی، عزت نفس اور ایثار و قربانی جیسے اوصاف اپنے اندر پیدا کیے۔ تصوف اور شاعری کا ذوق بھی جگر کو اسی ماحول سے ملا۔ جگر مرادآبادی بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ وہ شراب بہت پیتے تھے۔ عمر کے آخری ایام میں انھوں نے شراب سے توبہ کرلی اور شراب نوشی ترک کردی۔ جگر کے جاننے والے لکھتے ہیں کہ خواہ جگر جس قدر بھی نشے میں ہوتے کوئی لغو کلام ان کی زبان پر نہیں آتا۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ شراب کے نشے میں انسان اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں سلب ہوجاتی ہے تو اس سے کسی بھی غیر اخلاقی حرکت کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن جگر کے متعلق تمام خاکہ نگاروں کا بیان ہے کہ انھیں کسی نے کبھی شراب کے نشے میں بہکتے نہیں دیکھا۔ محمد طفیل اپنی کتاب ''صاحب'' میں لکھتے ہیں:

''جس نے جگر صاحب کو رندی کے زمانہ میں دیکھا اور بھالا ہے اس کا کہنا ہے کہ دھت پیئے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں لیکن تکلم کی نوبت جب بھی آئی تو انھوں نے مذہب و اخلاق اور شرافت نفس کے ہی تذکرے چھیڑے۔ آج جب شراب کو چھوڑے عرصہ گذر چکا ہے تو ان کی زبان پر وہی مذہب، وہی اخلاق، وہی شرافت نفس کی باتیں ہیں۔ سنا ہے کہ ہر رند پی کر باطن کی باتیں اگلتا ہے تو سوچتا ہوں کہ جگر صاحب کے زمانہ رندی اور اس وقت کی باتوں میں کتنی مطابقت ہے۔'' (ص 111۔ صاحب)

جگر کے اعلیٰ اخلاق و کردار کے بارے میں رشید احمد صدیقی بھی فرماتے ہیں کہ:

''جگر صاحب میں بڑی حیا اور غیرت تھی۔ کہیں کسی محفل میں بیٹھے ہوں، ہمیشہ نظر نیچی رکھتے تھے۔ جیسے اس محفل میں نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو اپنی ذمہ داری اور امانت سمجھتے ہوں۔ بے تکلف احباب میں بھی بیٹھ کر وہ اس طرح کے فقرے زبان پر نہیں لاتے تھے جن میں عورتوں سے بے راہ روی کے روابط کا اشارہ ملتا ہو۔ خواہ وہ فقرے کتنے ہی در پردہ کہے جاسکتے ہوں۔ (ص 217۔ گنج ہائے گرانمایہ)

جگر کافی خوش مذاق انسان تھے۔ دوستوں پر جان دیتے اور ان کی محفل میں کھل اٹھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں اتنی دلکشی اور محبوبیت تھی کہ لوگ ان سے ملنے کو بے قرار رہتے تھے۔ جہاں بھی جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ خوش مذاقی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے محمد طفیل لکھتے ہیں:

''ایک محفل میں جگر صاحب شعر سنا رہے تھے۔ ایک صاحب بے نیاز سے بیٹھے تھے۔ ایک شعر پر انھوں نے ایکا ایکی اور بے ساختہ داد دے ڈالی۔ جگر صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا:

آپ کے پاس قلم ہے؟

کیا کیجیے گا؟

''میرے اس شعر میں ضرور کوئی خرابی ہے ورنہ آپ داد نہ دیتے۔ اس لیے اسے اپنے دیوان سے خارج کرنا چاہتا ہوں۔'' (ص 119۔118۔ صاحب)

اسی سلسلہ کا ایک اور واقعہ لکھتے ہیں:

''ایک صاحب نے ان سے کہا ''جگر صاحب آپ کے ایک شعر پر ایک محفل میں پٹتے پٹتے بچا ہوں۔'' اس پر جگر صاحب نے کہا ضرور میرا وہ شعر تاثر کے اعتبار سے قطعی عاری ہوگا ورنہ آپ ضرور پٹتے۔ (ص۔119)

جگر مرادآبادی کے انداز گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختلف خاکہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی گفتگو بڑی بے ربط ہوتی تھی۔ ایک جملہ کچھ کہیں گے تو دوسرے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ خود محمد طفیل کے

الفاظ میں قارئین زیادہ لطف اندوز ہوسکیں گے

''جگر صاحب اپنی باتوں میں بعض اوقات ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ دوسرے کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اگر دوسرے کے پلّے کچھ پڑ گیا تو مزہ آ گیا۔ ان کی باتیں غزل کے شعر ہوتی ہیں۔ جس طرح غزل کے شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے علاحدہ ہوتے ہیں اسی طرح جگر صاحب کی باتوں کا مسئلہ ہے۔ ہر فقرہ اپنی جگہ مکمل، لیکن ایک فقرے کا تعلق دوسرے فقرے سے ذرا کم ہوتا ہے۔ جگر صاحب غزل مسلسل کے ذرا کم قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جگر کی باتوں میں بھی غزل مسلسل والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔''

(ص121۔صاحب)

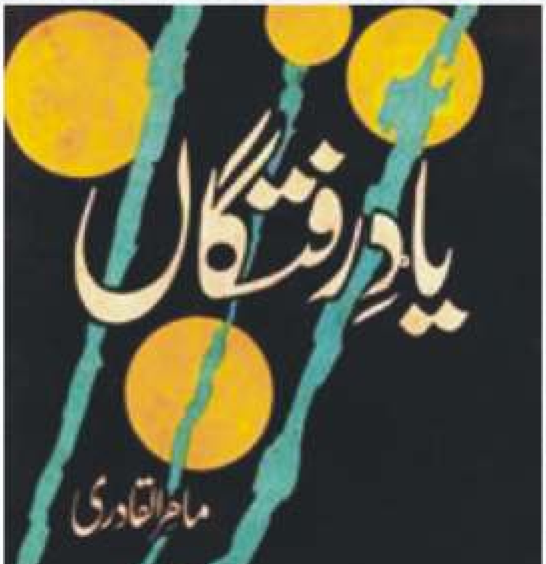

شاہد احمد دہلوی سے جگر مرادآبادی کی پہلی ملاقات جھانسی کے مشاعرے میں ہوئی۔ وہ ان کے کلام سے بہت ہی متاثر ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ جگر نے نور کا گلا پایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اندھیرے میں روشنی پھوٹ رہی ہو۔ ان کی آواز کے ساتھ تحریر سے بھی بڑے متاثر تھے۔ جگر بڑے ہی خوش خط تھے۔ کہتے ہیں کہ بظاہر بدشکل انسان کے اندر کتنی خوبصورتی پوشیدہ ہے۔ دولت ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ خواہ وہ کتنے ہی پیسے کے محتاج کیوں نہ ہوں لیکن انھوں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ جگر کو اپنی غیرت اور خودداری بہت عزیز تھی۔ چند واقعات کے ذریعہ شاہد احمد دہلوی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جگر کو روپیوں کا لالچ نہیں تھا۔ ان سے حسد کرنے والوں نے یہ خبر پھیلادی کہ جگر صرف پیسوں کے لیے شاعری کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری پھس پھسی ہے جب کہ ایسا قطعی نہیں ہے۔ دوستوں نے انھیں رئیس المتغزلین کا خطاب دیا تھا۔ ان کی یہ مقبولیت کسی کی خیرات نہیں تھی۔ وہ جس مشاعرے میں شامل ہوتے گویا مشاعرے میں جان آ جاتی۔ شراب کی لت تو پہلے سے ہی تھی۔ معصوم دل تھا۔ بعض قدر دانوں نے جگر کی اس معصومیت سے فائدہ اٹھایا۔ کسی کو جگر کا کلام سننا ہوتا تو جگر کو خوب پلاتے اور گھنٹوں ان کا کلام سنتے۔

ماہر القادری اپنی کتاب ''یاد رفتگاں'' میں لکھتے ہیں کہ جگر مرادآبادی کی بڑے بڑے علما اور نوابوں نے قدر و منزلت کی، لیکن انھوں نے ان کی ذات سے مالی فائدہ حاصل کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ زندگی میں کئی بار جگر کو کافی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس طرح کی کسی پیش کش کو قبول کیا۔ ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''ریاست ٹونک میں نواب صاحب کے خاص محل میں طرحی مشاعرے کی نشست ہوئی، فرشی نشست! تمام درباری اور سامعین قرینہ سے چاندنی پر بیٹھے ہوئے۔ نواب صاحب کی مسند وسط میں تھی، ابھی وہ آئے نہیں تھے۔ ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان کی مسند کے آس پاس جگہ نہ تھی مگر حفیظ جالندھری اور ساغر نظامی وہاں گھس کر اور بھینچ کر بیٹھے۔ ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں کے آنے پر مشاعرے کا آغاز ہوا۔ حضرت جگر نواب صاحب سے خاصی دور پر تشریف فرما تھے۔ مشاعرے کے بعد نواب صاحب تیر کی طرح تیز قدموں کے ساتھ سیدھے جگر صاحب کے پاس پہنچے اور بڑی محبت کے ساتھ فرمایا

''جگر صاحب ہاتھ تو ملا لیجیے۔''

ایک والیِ ریاست اور شہنشاہِ تغزل کے مصافحہ کا یہ منظر دیدنی تھا۔''

(ص465۔یاد رفتگاں، حصہ دوم)

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماہر القادری رقم طراز

ہیں۔خود ان کے الفاظ میں:

"اس تہی دستی کے زمانے میں جگر مرحوم کو یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ ایک اسٹیٹ کا فرماں روا ان سے متاثر ہے اور اس کی ذات سے مالی منفعت اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ایسے زریں مواقع کی جگر نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ وہ ہر دور میں خود اپنی طبیعت کے بادشاہ رہے۔" (ص465)

وہ کہتے ہیں کہ جگر کی شراب نوشی سے کبھی کسی دوسرے کا نقصان نہیں ہوا۔نہ ہی انھوں نے دوسروں کو شراب کی لت لگائی۔ بلکہ وہ اپنی اس بری لت پر ہمیشہ ہی نادم رہتے تھے۔شراب کے نشہ میں بھی ان کے دل میں خوف خدا رہتا تھا۔انھوں نے اپنی شراب کی لت کو نفس کی کمزوری سے تعبیر کیا۔اسی احساس ندامت نے انھیں گھنٹوں رلایا اور وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے عفوو مغفرت طلب کرتے تھے۔اور اس بری لت کے چھوٹ جانے کی دعائیں کرتے تھے۔آخر ان کی یہ دعا اللہ رب العزت کی بارگاہ میں قبول ہوئی۔

جگر مرادآبادی کی طبیعت میں جو سادگی، انکساری اور شرافت تھی اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ جس ماحول کے پروردہ تھے وہ خالص مشرقی ماحول تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشرقی تہذیب وتمدن کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتے تھے۔ان کے رہن سہن، طور طریقے، لباس، اخلاق، خلوص وضع داری غرض تمام شعبوں میں ان کا انداز خالص مشرقی تھا۔وضع کے بہت پابند تھے جس سے جیسے تعلقات تھے ان کو اسی طرح نباہتے۔ماہر القادری لکھتے ہیں:

"کسی دوست کے یہاں بچوں کو انھوں نے ایک بار دس روپیہ دے دیے تو اب جب بھی اس دوست کے یہاں جاتے یہ رقم بچوں کو ضرور دیتے۔نہ جانے ان کا کتنا روپیہ اس وضع داری کی نذر ہو جاتا۔(ص471۔یادرفتگاں، حصہ دوم)

محمد طفیل نے بھی اپنے خاکے میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جگر مرادآبادی کی رگ وپے میں مشرقیت سمائی ہوئی تھی۔کسی کے یہاں ملنے جاتے تو ان کے بچوں کے لیے کھلونے، پھل اور مٹھائی ضرور لے جاتے۔

ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ بمبئی میں فلم کمپنی کے ڈائریکٹر نے انہیں فلمی گانے لکھنے کے لیے بہت اصرار کیا تو وہ نیم رضامند ہوگئے، جس کے لیے جگر کو پیشگی پانچ ہزار روپیہ بھی دیے لیکن انھوں نے ماہر القادری کو اس واقعہ کے بعد ایک خواب کے بارے میں بتایا کہ وہ دیکھتے ہیں وہ غلاظت کرید رہے ہیں۔گویا میرے لیے یہ تنبیہ ہے کہ میں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالوں اور پھر انھوں نے بمبئی جا کر وہ رقم واپس کردی۔یہ تھا ان کی ذات کی پاکیزگی کا عالم۔ایک ایسا شخص جس نے زندگی کی پچاس بہاریں شراب کی نذر کردی لیکن جب اللہ نے ان کو ہدایت دی کیسے ان کے دل کو پھیر دیا اور عمر کے آخری بیس برس خالص مذہبی اور صوفیانہ طریقے سے زندگی گذاری۔

علی جواد زیدی نے جگر کے خاکے کی ابتدا ان پریشانیوں سے کی ہے جن کا سامنا انھیں اوائل عمری میں کرنا پڑا۔جگر کی زندگی جدوجہد کی داستان ہے، جوانی میں انھوں نے ذریعہ معاش کے طور پر عینک کا کاروبار کیا۔آبائی وطن بھی ایسا نہیں تھا جو شعروشاعری کے لیے مشہور ہو بلکہ مرادآباد برتنوں کے کاروبار میں مشہور تھا۔ایسی جگہ پرورش پانے والے انسان کے لیے کسی دوسرے ذرائع سے نام ونمود اور شہرت حاصل کرنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور تھا۔شاعری کے میدان میں بھی کافی جدوجہد کرنا پڑی۔لیکن قسمت کی خوبی کہیے کہ انہیں اصغر گونڈوی جیسے درویش کی قیادت حاصل ہوگئی۔اصغر گونڈوی نے جگر کو اپنے گوشۂ دل میں جگہ دی اور قدم قدم پر رہنمائی کی، مشکلوں میں کام آئے۔ان کی صحبت، محبت اور تربیت نے جگر کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔وہ اصغر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔تسکین قلب کی خاطر اصغر گونڈوی نے جگر کو قاضی شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کروایا، جس کی وجہ سے ان سے ایک روحانی تعلق پیدا ہوگیا جس نے جگر کی زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ان کے دل سے افسردگی اور پژمردگی ختم ہوگئی۔ان کے صوفیانہ خیالات میں دلکشی او رگہرائی پیدا ہوگئی۔غرض اصغر گونڈوی نے جگر کی زندگی میں ایک اہم رول ادا کیا، جس کا جگر نے بارہا اعتراف بھی کیا ہے۔

علی جواد زیدی نے جگر مرادآبادی کی نازک مزاجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جگر کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے، نہ ہی امراورؤسا کی شان میں قصیدہ پڑھا۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جگر کے مزاج میں جاگیردارانہ خصائص نے گھر کرلیا تھا۔وہ بات بات پر الجھتے تو نہیں تھے لیکن ان کو اپنی فن کی عظمت کا پورا احساس تھا۔کوئی بھی ایسی بات جو ان کے مرتبہ سے گری ہوئی ہو وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے۔انہیں یہ بات بہت ناگوار گذرتی جب کوئی ان کی دعوت کے بعد ان سے کلام سننے کی فرمائش کرتا۔جو ایسا نہیں کرتے تھے جگر اس محفل سے بہت خوش ہو کر اٹھتے اور اپنی خوشی سے سامعین کو اپنی ترنم آمیز غزل سے محظوظ کرتے۔

زیدی صاحب لکھتے ہیں کہ اواخر زمانہ اپنی معاش کی طرف سے زیادہ پریشانی تھی۔مشاعرے ان کی معاش کا ذریعہ تھے۔کتابوں کی رائلٹی سے بھی پیسے مل جاتے تھے۔لیکن وہ اپنی فضول خرچی اور کچھ

دوستوں کی بدولت کچھ بچا نہیں پاتے تھے۔ بیوی سلیقہ شعار تھیں۔ اپنی کفایت سے اسی آمدنی میں گونڈہ میں ایک گھر بھی بنالیا تھا اور آسودگی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

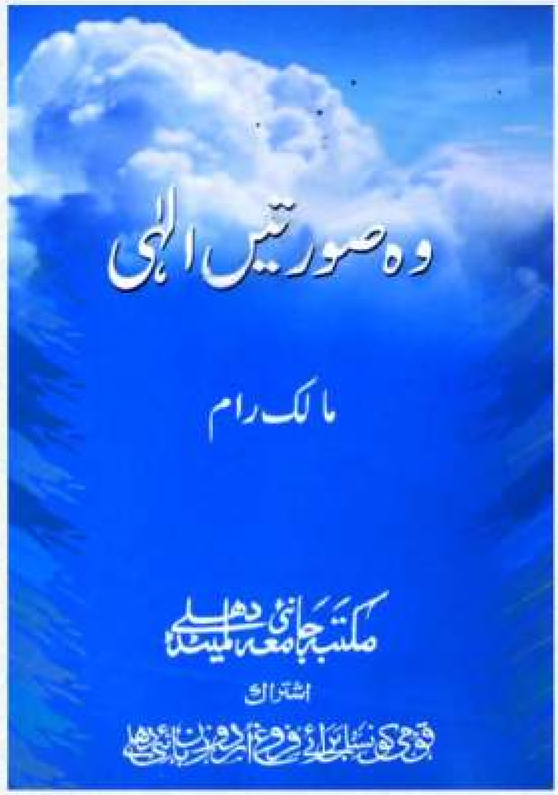

جگر ذوق اور ذائقہ کے معاملے میں بھی بلند خیال واقع ہوئے تھے۔ اچھے کپڑے اور اچھے کھانے کا شوق تھا۔ اس کے علاوہ سگریٹ اور پان اور رمی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ شراب چھوڑنے کے بعد تاش کا شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ جب کھیلنا شروع کرتے تو اس میں اتنا محو ہو جاتے کہ آس پاس کے ماحول سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتے۔ کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا اور دو دو دن تک مسلسل کھیلتے رہتے۔ ان کے نیاز مند جو ملاقات کرنے آتے گھنٹوں بیٹھے رہتے لیکن بیزار نہیں ہوتے اور جگر صاحب کا تو یہ حال تھا کہ بقول محمد طفیل:

"کھیلنے میں اگر کوئی دوست آگیا تو آپ کی نظر پتوں پر ہوگی اور وعلیکم السلام کو لمبا کر کے جواب دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد آنے والے کی صورت دیکھیں گے پھر پوچھیں گے مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟ پھر کھیل شروع۔ آدھ پون گھنٹہ کے بعد ان صاحب کی موجودگی یاد آئے گی تو پھر پوچھ لیں گے۔ مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟ اگر رات بھر آپ ان کے پاس بیٹھے رہیں تو یہی پوچھتے رہیں گے: مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟" (ص124۔ صاحب)

یوں تو دیگر خاکہ نگاروں نے بھی جگر مرادآبادی کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی ہے اور ان کے ایک ایک خد و خال کی نمائندگی کی ہے مگر علی جواد زیدی کا انداز جداگانہ ہے۔

"اکثر لوگوں کو جگر کا حلیہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے مشہور اردو شعرا میں خالص ہندوستانی رنگ، رنگ ہندوستانی سورج کی تیز آنچ میں پختہ کیا ہوا۔ رنگ غالباً صرف دو شاعروں کو ملا تھا۔ آرزو لکھنوی اور جگر مرادآبادی۔ جگر کے چہرے پر چیچک کی گلکاریوں نے اس رنگ کے ساتھ وہی کیا جو سہاگہ سونے کے ساتھ کرتا ہے۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو کڑوے کریلے کے نیم چڑھنے کا ہوتا ہے۔ گھنی فرنچ ڈاڑھی نے بھی کوئی خاص فرق نہیں پیدا کیا۔ عمر کے اعتبار سے اب پیری و شباب گلے مل رہے ہیں۔ اس لیے داڑھی اور سر کے بال کھچڑی ہو چلے ہیں۔ لمبا قد، چوڑی دار پاجامہ، بال دار ٹوپی، شیروانی اوپر کے جیب میں چشمہ، نیچے کے جیبوں میں پوری کائنات۔ سگریٹ دیاسلائی، پانوں کی ڈبیہ، چھالیہ کا بٹوہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔۔

جگر کے حلیہ کا سب سے تنگ نظر نقاد بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر یہ ریگستان ہے تو اس ریگستان میں بھی ایک بہت ہی خوش نما نخلستان ہے۔ جگر کے لمبے لمبے بال۔ بالوں کا ایک حصہ تو پٹے کی طرف اصغر گونڈوی سے انتہائی ارادت کی ترجمانی کرتا رہتا ہے۔ لیکن دوسرا حصہ وہ ہے جو ٹوپی کے کناروں سے راستہ نکال کر پیشانی کے ایک گوشے اور چہرے کی رونق بڑھاتا ہے۔" (ص71-70۔ 'آپ سے ملیے')

مالک رام اپنی کتاب "وہ صورتیں الٰہی" میں جگر کے متعلق لکھتے ہیں کہ جگر کی شخصیت بڑی پیاری اور دل آویز تھی۔ دل کے صاف اور زبان کے کھرے، وہ کسی کے برے میں نہیں تھے۔ میں نے کبھی کسی کی غیبت کرتے انہیں نہیں سنا۔ دوسروں کی برائیوں کے بجائے وہ ان کی خوبیوں کا ہی بیان کرتے۔ نقص کی توجیہہ کرتے بھی تو اس طرح کے وہ بظاہر کم دکھائی دینے لگتی۔

مالک رام نے جگر کے متعلق بہت سے دلچسپ واقعہ کا ذکر اپنے خاکے میں کیا ہے، جو خاصا طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ بھوپال میں جس زمانہ

میں جگر مرادآبادی قیام پذیر تھے۔ ایک انجمن بنائی گئی تھی جو کاہلوں کی انجمن تھی۔ اس کا نام ''انجمن الکاہلا'' رکھا گیا۔ جس کے صدر جگر تھے۔ اس انجمن کا مقصد ہی تھا سکون اور کاہلی کی تبلیغ کرنا۔ تمام ممبران کے نام بھی اس کی ذاتی خصوصیات کے اعتبار سے طے کیے گئے تھے۔ مثلاً ام الکاہلا، فتنۃ الکاہلا، دبیز الکاہلا، طویل الکاہلا، بلیغ الکاہلا، صبیح الکاہلا، قندر الکاہلا وغیرہ وغیرہ۔

''مالک رام نے ان کی سیرت اور کردار کا جو رخ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ کتنا دلکش ہے ، وہ لکھتے ہیں کہ ہر انسان کی ذات میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں. بے عیب ذات تو خدا کی ہے ۔ جگر صاحب میں بھی کمزوریاں تھیں لیکن ان کی خوبیوں کے مقابلے ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔''

اس انجمن کی کوئی خاص سرگرمیاں نہ تھیں۔ سرگرمی کے معنی ہیں عمل کے اور عمل اور کاہلی میں تضاد ہے۔ البتہ بعض اوقات تفریحات ضرور ہوتی تھی۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ کوئی ممبر تجویز پیش کرتا کہ اس وقت شاعری ہو جائے یا شطرنج یا کیرم ہو جائے یا چائے پی جائے وغیرہ۔ صدر انجمن تمام ممبران کی ایما معلوم کر کے فیصلہ کا اعلان کر دیتے اور پھر اس پر عمل شروع ہو جاتا۔

مالک رام نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جگر مرادآبادی کے اندر قوت ارادی کا فقدان تھا۔ وہ اپنے آپ سے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے جس سے دوسروں کی دل شکنی ہو۔ لکھتے ہیں:

''ایک دن خاصی رات گئے ان کے ڈاڑھ میں درد ہونے لگا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ اس وقت جو چھوٹا موٹا گھریلو علاج ممکن تھا کیا گیا لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ رات انھوں نے بہت بے چینی سے کاٹی۔ اگلی صبح ان کو جو شامت آئی، مختصر سا ناشتہ کر کے اکیلے طبیہ کالج چلے گئے کہ وہاں کسی حکیم صاحب سے دکھا کے دوا لے آئیں۔ وہاں جو پہنچے تو لڑکوں نے پہچان لیا۔ اب کیا تھا وہ انھیں گھیر گھار کے کالج کے ہال میں لے گئے اور دو گھنٹہ تک ان سے کلام سنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاج تو خیر کیا ہوتا جب یہ وہاں سے لوٹے ہیں تو ان کی مظلوم صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف دانت کا درد بدستور تھا سر کے درد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ گئے تھے روزے بخشوانے نماز گلے پڑی۔ میں نے پوچھا آخر آپ نے یہ کیوں کیا۔ انکار کر دیا ہوتا تو رونی صورت بنا کے کہنے لگے: بھائی میں کیا کرتا وہ طالب علم اتنی محبت سے اصرار کر رہے تھے کہ مجھ میں انکار کی ہمت نہ رہی۔

(ص181۔ وہ صورتیں الٰہی)

مالک رام نے ان کی سیرت اور کردار کا جو رخ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ کتنا دلکش ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہر انسان کی ذات میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ بے عیب ذات تو خدا کی ہے۔ جگر صاحب میں بھی کمزوریاں تھیں لیکن ان کی خوبیوں کے مقابلے ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اور یہ تو ارشاد خداوندی ہے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جو شخص جگر کو جتنا قریب سے دیکھے گا اتنا ہی ان سے محبت کرے گا۔

جگر مرادآبادی کی وطن دوستی اور ان کے حب الوطنی کے ترانے ہم سبھوں کے لیے درس عمل اور مشعل راہ ہیں۔ انھیں اپنے ملک سے عقیدت کی حد تک پیار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے ان کو بنگلہ اور عیش و عشرت کے تمام سامان فراہم کیے جانے کا وعدہ کیا گیا کہ وہ پاکستان آ جائیں لیکن ان کی قومی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مریں گے تو ہندوستان میں جئیں گے تو ہندوستان میں۔ جگر کے بہت سے احباب ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جس کا انہیں بے حد افسوس ہوا۔ اس کا اندازہ ان کے مختلف خطوط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے ہندوستانی احباب کو لکھے ہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں جگر مرادآبادی نماز روزہ کے بہت پابند ہو گئے تھے۔ حج کی سعادت بھی انہیں نصیب ہوئی۔ جن کے ساتھ ہر وقت شراب کی بوتلیں رہا کرتی تھیں اب ان کے پاس جانماز ہوتا تھا۔ خوف خدا سے ہمہ وقت ان کا دل مغموم رہا کرتا تھا۔ اپنے پچھلے گناہوں پر نادم رہتے تھے۔ مے نوشی کے زمانے میں اہلیہ کو جو ان کی ذات سے تکلیف پہنچی اس کا بھی انھوں نے ازالہ کیا۔ جب بھی باہر جاتے بیش قیمت تحائف ساڑیاں اور زیورات ان کے لیے لے کر آتے۔ جب ان کے احباب منع کرتے تو جگر کہا کرتے کہ میری ذات سے ان کو بہت تکلیف پہنچی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنے گناہوں کا ازالہ کر سکوں۔

ان خاکوں کے مطالعہ اور تجزیہ سے جہاں ایک طرف جگر کی شخصیت کے اہم خد و خال واضح ہوتے ہیں اور ان کے اخلاق و کردار اور سیرت کی خوبیاں اور خامیاں جیسے خودداری، عزت نفس، انسانی دردمندی،

اعلیٰ ظرفی، مروت وسخاوت، بے باکی، بلند اخلاق وغیرہ نکھر کر جلوہ افروز ہوتی ہیں وہیں دوسری طرف خاکوں کا دلچسپ شگفتہ اور لطف انگیز اسلوب فکرو نظر کو مہمیز کرتا ہے اور قلب وروح کی گہرائی میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

OOO

کتابیات

کتب	مصنف	ناشر	سنہ اشاعت
صاحب	محمد طفیل	ادارہ فروغ اردو لاہور	
وہ صورتیں الٰہی	مالک رام	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	2011
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	2011
چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی	مکتبہ جدید دریا گنج نئی دہلی	2003
آپ سے ملئے	علی جواد زیدی	مکتبہ شاہراہ دہلی	1963
جگر مرادآبادی حیات اور شاعری	ڈاکٹر محمد اسلام	سرفراز پریس لکھنؤ	1966
جگر مرادآبادی ایک مطالعہ	ضامن علی خان	ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	1984
مرآت جگر	عزیز احمد عزیز	نیشنل سوشل آرگنائزیشن فیض گنج مرادآباد	2001
جگر معاصرین و متعلقین کی نظر میں	ڈاکٹر محمد اسلام	نظامی پریس لکھنؤ	1966
درد آشنا چہرے	کشمیری لال ذاکر	موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	1998
تماشائے اہل قلم	محمد لطف اللہ خاں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	2007
جان پہچان	نظیر	صدیقی اردو اکاڈمی سندھ کراچی	1979
اکثر یاد آتے ہیں	مظہر امام	ادب پبلی کیشنز نئی دہلی	1993
دید و شنید	رئیس احمد جعفری	رئیس احمد جعفری اکاڈمی کراچی	1948
یادِ رفتگاں (حصہ دوم)	ماہر القادری	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی	

□□□

Sabiha Nasreen
Valibasha house 716/C
Sayed block 5th Cross, Vimanpura
Bangalore 560017 (Karnatak)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

آفرین فاطمہ

تانیثیت اور اردو ناول

''تانیثیت'' عربی لفظ 'تانیث' سے مشتق ہے۔ انگریزی میں ''Feminism'' کے نام سے متعارف ہوا جو کہ لاطینی اصطلاح ''Femina'' کا مترادف ہے۔ اردو میں تانیثیت، تحریک نسواں، حقوق نسواں، ہندی میں ناری آندولن وغیرہ کے نام سے لوگوں کے مابین عام ہوئی۔ پہلے پہل یہ رجحان فرانس میں متعارف ہوا، اور رفتہ رفتہ اس کے اثرات برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور پھر برصغیر میں بھی نظر آنے لگے اس طرح یہ رجحان بین الاقوامی سطح پر اپنا کام انجام دینے لگا۔

اس رجحان کے بنیادی نظریات یہ تھے کہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، تعلیمی، اخلاقی، تہذیبی، غرض ہر سطح پر مرد اور عورت کے درمیان حائل فرق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ عورتوں کو ان کے جائز حقوق دئے جائیں، ظلم واستبداد سے آزاد زندگی فراہم کی جائے، حق تلفیاں اور ان پر ہورہے ظلم واستحصال کے خلاف آواز اٹھائی جائے، بین الاقوامی سطح پر سماجی واقتصادی لائحہ عمل وجود میں آئے ان تمام حقوق کے مطالبے کی یہ فکرہی دراصل تانیثیت ہے۔

پہلے پہل مغرب میں اس تانیثی فکر نے زور پکڑا اس کے بعد اردو ادب بالخصوص اردو فکشن میں تانیثی نظریات وتصورات کے گہرے نقوش نظر آنے لگے۔ اردو ناولوں میں عورت کو سماج کے ایک جیتے جاگتے کردار کے طور پر پیش کیا جانے لگا، عورت کو زبوں حالی اور پسماندگی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے ان کی زندگی کے تمام حالات ومسائل کو موضوع بحث بنایا گیا اسی تانیثی فکروشعور کی اردو ناول میں ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔

اردو ناول کی دنیا میں ڈپٹی نذیر احمد کو یہ امتیاز حاصل ہے اور رہے گا کہ وہ اردو ادب کے پہلے ناول نگار تھے جنھوں نے معاشرتی اور تہذیبی سیاق وسباق میں عورت کے کردار اور اس کے مسائل پر سب سے پہلے توجہ کی۔ نذیر احمد سے پہلے عورت کا ذکر بہت ملتا ہے لیکن محض ایک محبوبہ اور طوائف کی حیثیت سے۔ ایک عورت محبوبہ اور طوائف کے علاوہ، بہت کچھ ہوتی ہے وہ بیٹی، بہو، ماں اور بیوی بھی ہوتی ہے لیکن اس حیثیت سے عورت کا بیان اردو ناول میں بالکل ناپید تھا نذیر احمد نے پہلی مرتبہ اس احساس سے لوگوں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ عورت بھی اس معاشرے میں ایک فرد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس اعتبار سے اس کو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ عورت کی اہمیت کو گھر کی فضا کی تعمیر میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نذیر احمد کا عورت سے متعلق تعلیمی اور اصلاحی نقطۂ نظر قابل داد ہے جو انھوں نے اپنے ناولوں ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح''، ''فسانہ مبتلا''، ''ابن الوقت''، ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' وغیرہ میں موضوع بحث بنایا ہے۔ نذیر احمد نے کوئی بڑا انقلابی قدم تو نہ اٹھایا لیکن عورت کو منفی انداز ورویے سے بچانے کے لیے معاشرے کی نظروں میں ایک کارآمد انسان بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ

بات واضح ہوتی ہے کہ تانیثی فکر وشعور کی اولیت کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر ہے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل کے ناول نگاروں میں رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، علامہ راشد الخیری اور مرزا ہادی رسوا وغیرہ نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج کے اس دبے کچلے طبقے کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو منظر عام پر لانے اور عورتوں کے تعلیمی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کو عصری تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ رتن ناتھ سرشار نے ''فسانہ آزاد'' اور'' کامنی'' جیسے ناولوں میں تعلیم نسواں اور خواتین کی اذیت ناک زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کا اندازہ ان کے ناول ''فسانہ آزاد'' کی ہیروئن حسن آرا کی گفتگو سے ہوتا ہے کہ سرشار کے ہاں عورتوں کی تعلیم وتربیت کا کیا معیار تھا سرشار کے ناول کی ہیروئن کہتی ہے:

''ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہم یہاں مدرسہ نسواں قائم کریں ......میں نے ایک لکچر لکھا ہے۔ میاں آزاد اگر اصلاح دے دیں تو میں کسی دن یہاں کی شریف زادیوں کو جمع کر کے لکچر دوں، شاید کسی کے دل پر اثر کرے اور کوئی نتیجہ نکلے''۔

(فسانہ آزاد جلد اول، رتن ناتھ سرشار، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1986، ص۔510)

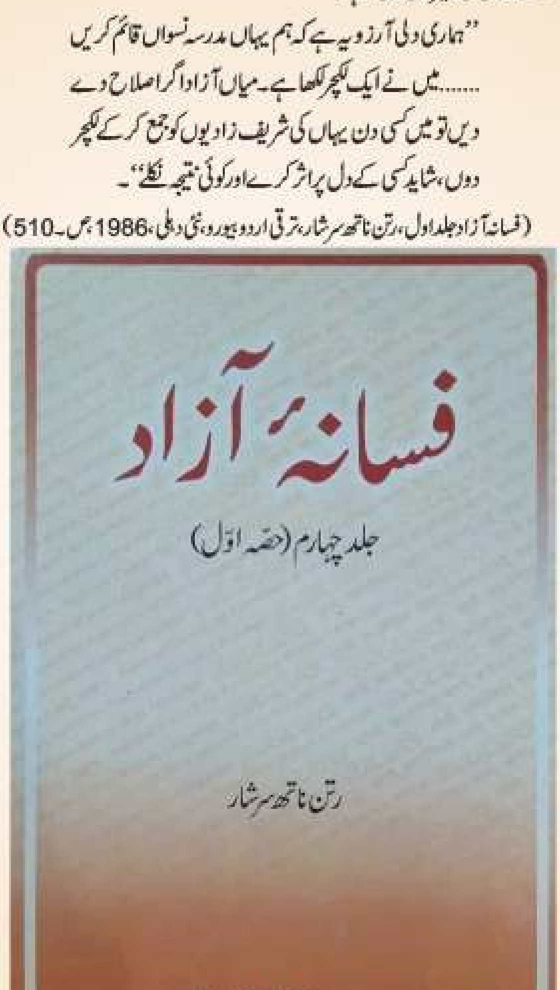

دوسری جگہ سرشار اپنے ناول میں بزبان کردار عورت کی تعلیم کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں:

''سب یہی کہیں گے کہ تعلیم النساء ممنوع نہیں ہیں۔ دھرم شاستر اور شرع محمدیؐ دونوں کی رو سے اس کا جواز ظاہر ہے۔ اگر شرع محمدیؐ کی رو سے عورتوں کی تعلیم ناجائز ہوتی تو اہل اسلام کی وہ عورتیں جو مقدسہ سمجھی جاتی ہیں، اور جو واقعی میں اس لائق تھیں کہ ان کے نقش قدم پر چلے، اور ان کے چال چلن کو دستور العمل بنائے علم وفضل سے ضرور محروم رہتیں۔ ظاہر ہے کہ علم کے بغیر شرع محمدی کو مرد ہو یا عورت کوئی بخوبی سمجھ نہیں سکتا۔ اور جب تک بخوبی نہ سمجھے گا، ضرور ناقص العقل رہے گا پس دین کی ترقی کے لیے لازم آیا۔ ذکور ہی نہیں بلکہ اناث بھی تعلیم پائیں''۔ (ایضاً، ص۔515)

رتن ناتھ سرشار کی ہیروئن حسن آرا میاں آزاد کا انتخاب خود کرتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرشار شادی کے معاملے میں بھی خواتین کی آزادی رائے کے قائل تھے جبکہ اس عہد کے معاشرے میں یہ چیز بڑی عیب سمجھی جاتی تھی حالاں کہ یہ عورت کا پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے ہمسفر کا انتخاب خود اپنی پسند وناپسند کی بنا پر کر سکے۔

اسی دور کے تیسرے اہم ناول نگار عبدالحلیم شرر ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقے کی عورتوں کی اصلاح کو اپنا موضوع بنایا اور یہ احساس دلایا کہ جاہل اور ناتربیت یافتہ عورتیں گھریلو نظام اور معاشرے کی تباہی کا سبب بنتی ہیں، عورتوں میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ سماج اور معاشرے میں ایک اعلی کردار ادا کر سکیں لیکن غلط تربیت کم علمی اور جہالت کی بنا پر ان کو تعلیم حاصل کرنے اور ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے، ان کے ایک اہم ناول ''دلچسپ'' میں بیوہ کی شادی کی پرزور حمایت کی گئی ہے۔

ان کے بعد ایک اہم ناول نگار علامہ راشد الخیری ہیں جنھوں نے عورت کی معاشرتی حیثیت کو بلند کرنے اور ان کے مسائل کے بارے میں ہمدردانہ جذبہ کو ناول کا حصہ بنایا ہے''۔ صبح زندگی'' اور'' شام زندگی'' جیسے ناول ان کے فکری رویے کی شہادت دیتے ہیں۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم وتربیت وخودداری جیسے اخلاقی پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کی اور اسی وجہ سے وہ 'مصور غم' کہلائے۔ اس سلسلے کا ایک اہم نام مرزا ہادی رسوا کا ہے۔ جنھوں نے عورت کی نفسیاتی وذہنی کشمکش کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے، جس کا زندہ ثبوت ان کے شاہکار ناول ''امراؤ جان ادا'' کے طور پر سامنے ہے۔ اس ناول کی ہیروئن سماج کی ناہمواریوں کا شکار ہوکر ایک

طوائف بننے پر مجبور ہو جاتی ہے اور اسی طرح ان کے دوسرے ناولوں میں بھی معاشرے کی انھیں ناہمواریوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اردو ناول نگاری میں پریم چند کے ذریعہ ایک نئی روایت کی داغ بیل پڑی۔ انھوں نے اردو ناول کو نت نئے مسائل سے روشناس کرایا۔ ان کے ناولوں میں بھی تانیثی فکر و شعور کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں "بیوہ" "بازارِ حسن"، "میدانِ عمل"، "نرملا" اور "گئو دان" وغیرہ میں بیواؤں کی شادی، ستی پرتھا اور دوسرے تمام نازک اور سنجیدہ مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ پریم چند نے طوائف بازاری، جہالت، ذہنی غلامی، اقتصادی پسماندگی جیسے اہم مسائل کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے ناول "بیوہ" میں مسز امرت کی بالادستی کے خلاف کہتی ہے:

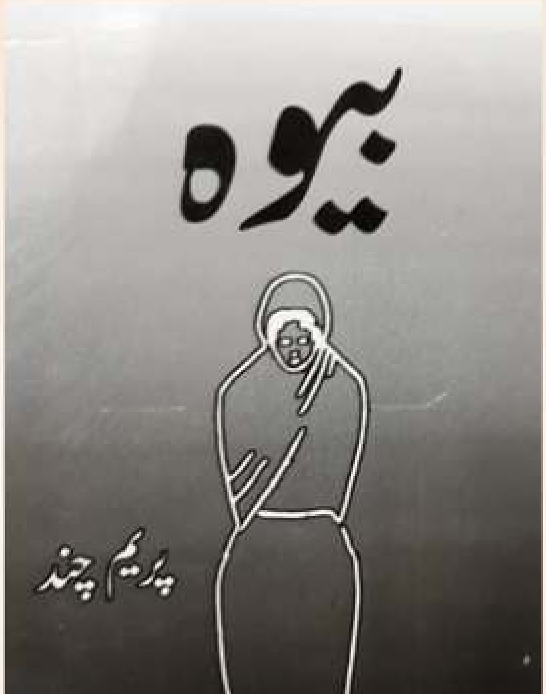

"عورت مرد کے پیر کی جوتی کے سوا اور ہے ہی کیا؟ مرد چاہے جیسا ہو، چور ہو، ٹھگ ہو، بدکار ہو، شرابی ہو، عورت کا فرض ہے کہ اس کے پیروں کی دھول دھو کر پیے"۔

(بیوہ، پریم چند، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 2014ص۔67)

قاضی عبدالغفار اردو ناول کی دنیا میں اپنے منفرد لب و لہجہ کے باعث مشہور ہیں انھوں نے طوائفوں کی تلخ زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ وہ اپنے ناول "لیلیٰ کے خطوط" میں مرد اور عورت کے جنسی تعلق کو سماجی بنیادوں پر استوار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ جب تک ایسا نہ ہوگا عورت محض سرمایہ تجارت بنی رہے گی عزیز احمد "لیلیٰ کے خطوط" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ اس کاغذی پیرہن میں خراب آباد ہندوستان کی نسوانی زندگی کے چند نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے......ان خطوط کے لکھنے والی 'لیلہ بنت لیلہ بنت لیلہ پیشہ عصمت فروش، وطن ہندوستان، سمجھدار زود فہم، چالاک، ذہین، شریر، بدمعاش حرافہ کوئی معمولی بیسوا نہیں، وہ ایک مجسم استعارہ ہے جس کے پردے میں ہندوستان کی زخم خوردہ اور مظلوم نسوانیت نظر آتی ہے"۔

(ترقی پسند ادب، عزیز احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1945ص۔10099)

قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ دوسری طوائفوں سے الگ ہے۔ وہ ایک ایسی طوائف ہے جو اس پیشے کی باطنی حقیقت ہے۔ عورت کے حوالے سے ان کے یہاں خیال اور حقیقت کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے ناول کی ہیروئن سماج کے پدرانہ نظام اور اپنی ذہنی پسماندگی کو آئینہ دکھاتی نظر آتی ہے۔

اردو فکشن میں خواتین قلم کاروں میں عصمت چغتائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، اردو ناول کی دنیا میں وہ ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں تانیثی فکر ملتی ہے، وہ مرد اساس سماج کے جبر و تشدد اور طبقاتی کشمکش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے ناول "ٹیڑھی لکیر" کی شمن "ضدی" کی آشا سماجی اور طبقاتی کشمکش کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی ہیں یہ دونوں معاشرے کے جبر و استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ اسی ظلم و زیادتی کی عصمت کے ہاں جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔

عصمت کے علاوہ قرۃ العین حیدر اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ ان کے یہاں یہ تانیثی فکر دوسرے تخلیق کاروں سے مختلف ہے۔ان کے یہاں وقت کا تصور ملتا ہے انھوں نے عورت کو زمان ومکان کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں عورت کی تنہائی، جلاوطنی، ہجرت اور استحصال ولاچاری کو موضوع بحث بنایا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں ''آگ کا دریا''،''میرے بھی صنم خانے''،''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''آخرشب کے ہم سفر'' وغیرہ میں چمپا، رخشندہ، ثریا حسین اور دیپالی سرکار وغیرہ کے ذریعہ ان موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

تانیثی نظریات وتصورات کے اعتبار سے خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے اپنے اس ناول میں عورتوں کے ذہنی کرب، گھٹن، لاچاری وبے بسی کو پیش کیا ہے اور تقسیم ہند کے تناظر میں عورتوں کو پیش آنے والے مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔ناول ''آنگن'' کے نسوانی کردار 'عالیہ' اور 'چھمی' کے ذریعہ سماجی ناہمواریوں اور بدعنوانیوں کو دکھایا گیا ہے۔

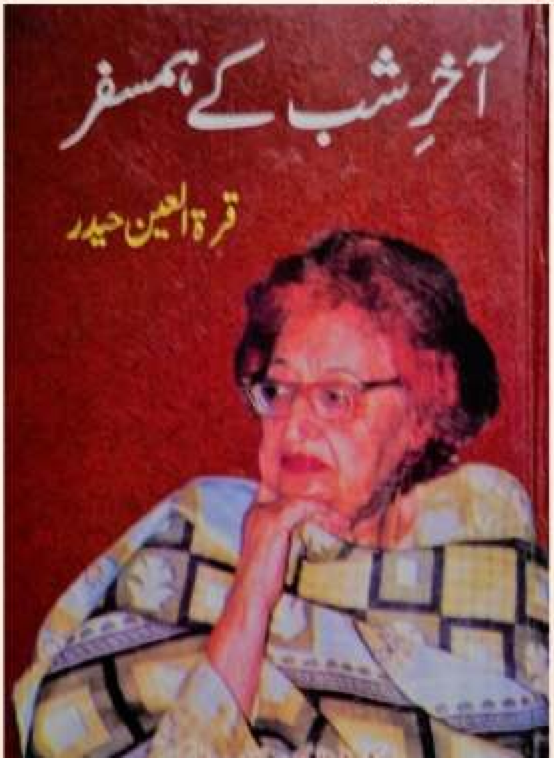

جدید خواتین ناول نگاروں میں جیلانی بانو کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے اپنے ناول ''ایوان غزل'' میں مرد اساس سماج کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کی بدحالی وپسماندگی کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ان کا دوسرا اہم ناول ''بارش سنگ'' ہے۔جس میں انھوں نے عورتوں کی شکستہ حالی اور کرب ناکی کی دردانگیز کہانی بیان کی ہے۔اس طرح ان کے ہاں تانیثی فکر کی روح نظر آتی ہے۔

ان تمام فکشن نگاروں کے علاوہ دوسرے ہمعصر ناول نگاروں نے بھی تانیثی تناظر میں عورتوں کی زندگی کو دیکھنے پرکھنے کی کوشش کی ہے جن میں پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کی ہیروئن 'نیرا' اپنے حرکت وعمل اور جذبات واحساسات کی بنا پر تانیثی فکر کی ایک مضبوط آواز بن کر ابھرتی ہے اور ایک نئی منزل کا پتہ دیتی ہے۔اس کے علاوہ ''ندی'' شموئل احمد ''فرات'' حسین الحق ''مورتی'' ترنم ریاض ''دھنک'' عبدالصمد وغیرہ نے تانیثی فکر وشعور کے ذریعہ نئی راہیں ہموار کی ہیں اور شعوری طور پر تمام مسائل کا حل تلاش کرنے اور لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

الغرض یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو ناولوں میں تانیثیت کے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر ابتدا ہی سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔مرد ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین ناول نگاروں نے بھی اپنے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی اور اقتصادی پس منظر میں عورتوں کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔اس تانیثی فکر کے ذریعہ ان ناول نگاروں نے خواتین پر ظلم واستبداد کو رد کرتے ہوئے نسائی شناخت وجمالیات اور حقوق نسواں کی بات کی ہے تاکہ خواتین بہتر زندگی گزار سکیں، اپنا وجود منوا سکیں، مصائب وآلام سے دوچار ہونے کے باوجود عزم وہمت سے آگے بڑھتے رہنا ہی اپنا منصب سمجھیں اور وہ عزت وتکریم حاصل کر سکیں جو برسوں پہلے اسلام نے عورتوں کو عطا کی تھی۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مرد فکشن نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین فکشن نگاروں کو بھی فعال اور متحرک رہنے کی ضرورت ہے۔تاکہ ظلم واستحصال کا یہ طوفان تھمے اور ایک خوشحال معاشرہ وجود میں آسکے۔

□□□

Afreen Fatima
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligargh Muslim University
Aligargh-202001 (U.P)

راحلہ پروین

پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری

موضوعات و اسالیب

پیغام آفاقی کا شمار دور حاضر کے ممتاز و منفرد فکشن نگاروں میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے اپنے فکر و فن کی بنیاد پر ایک نئی تخلیقی راہ ہموار کی۔ان کے افسانوی سرمایہ میں دو ناول ”مکان“(1989)، ”پلیتہ“(2011)اور ایک افسانوی مجموعہ ”مافیا“(2000) شامل ہیں۔ پیغام آفاقی ناول اور افسانہ دونوں ہی اصناف پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔”مکان“ نے شائع ہوتے ہی اردو دنیا میں ہلچل مچادی تھی۔اس کے بعد ان کے ناول ”پلیتہ“ نے بھی ادبی حلقے میں خوب پذیرائی حاصل کی۔یہی وجہ ہے کہ پیغام آفاقی کی شخصیت ایک ناول نگار کی حیثیت سے مستحکم ہوگئی لیکن ناولوں کے علاوہ وہ افسانے بھی لکھتے رہے اور 2002 میں جب ان کا افسانوی مجموعہ ”مافیا“ منظر عام پر آیا تو ادبی دنیا نے بخوبی محسوس کیا کہ ادب سے ان کا شغف بچپن ہی سے تھا۔خصوصاً فکشن سے انھیں خاصی دلچسپی تھی۔

پیغام آفاقی کا اصل نام اختر علی فاروقی تھا اور قلمی نام پیغام آفاقی۔ اسی قلمی نام سے انھیں ادبی دنیا میں شہرت ملی۔ان کی پیدائش صوبہ بہار کے ضلع سیوان کے چانپ نامی گاؤں میں 6/فروری 1953 کو ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران انھوں نے افسانوی زندگی کا آغاز کیا۔1973 میں انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ”برگد کا پیڑ“ کے عنوان سے لکھا۔اپنے افسانوی سفر سے متعلق وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:

> ”اردو کہانی ترقی پسند کہانیوں کے دور سے زوال پذیر ہوتی ہوئی جہاں سطحی پن کا سہارا لینے لگی تھی اور جدید کہانی جہاں نئی فکری ضرورتوں سے نپٹنے کی ایک ناکام جنگ لڑ رہی تھی اس وقت میں نے 1973 کے آس پاس فکری ممکنات کی کہانیاں لکھنے کا آغاز کیا تھا۔“(مافیا،ص16)

پیغام آفاقی کے مشاہدات و تجربات بہت تیز ہیں جو کسی ادب پارے میں ڈھل کر اس کے سماجی اور سیاسی ماحول کو شعوری یا غیر شعوری طور پر لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ پولیس محکمہ سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے پولیس محکمہ میں رہتے ہوئے زندگی کے

نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔محکمہ پولیس میں رہ کر انھوں نے اچھے برے، نیک وبد،ظالم ومظلوم ہر طرح کے لوگوں کو دیکھا اور پرکھا تھا جس نے ان کے مشاہدہ میں وسعت اور تجربہ میں گہرائی پیدا کردی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ مشاہدات وتجربات پوری فنکاری اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کر دیے ہیں۔ان کے افسانوں کے واقعات وکردار بھی ان کے گہرے مشاہدات وتجربات کا ٹھوس ثبوت پیش کرتے ہیں۔پیغام آفاقی کے کردار حشاش بشاش اور متحرک ہوتے ہیں۔ کردار کسی بھی کہانی کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں۔کہانی کو انہی کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے۔کہانی کا ایک مرکزی کردار ہوتا ہے جو اس کہانی کا ہیرو یا ہیروئن کہلاتا ہے۔بعض ضمنی کردار ہوتے ہیں جو کہانی کو مزید آگے بڑھانے کا کام کرتے ہیں۔کرداروں کا حساس ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے افسانہ نگار کا نہ صرف یہ کہ حساس بلکہ کرداروں کے اندرون میں جا کر ان کی نفسیات سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''افسانے میں ایسے کرداروں کا ذکر ہونا چاہیے جو حساس ہوں،اپنا اپنا شعور رکھتے ہوں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے کردار کو وضاحت سے بیان کرنے کے لیے اس کے داخلی زندگی اور MENTAL EVENTS کی گہرائیوں میں جانے کے سوا چارہ نہیں۔''(نیا اردو افسانہ،ص33)

پیغام آفاقی کے افسانوں کے تمام کردار فاروقی کے بیان کردہ معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ان کے کردار خواہ مرکزی ہوں یا ضمنی سب کے سب حقیقی اور فطری معلوم ہوتے ہیں۔انھوں نے جامد اور غیر حقیقی کرداروں سے اپنی افسانوی دنیا کو محفوظ رکھا ہے۔

پیغام آفاقی اپنے زیادہ تر افسانوں میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔بیشتر افسانوں میں وہ خود ہی واحد متکلم کی شکل میں کردار بن کر سامنے آتے ہیں۔ان کے افسانوں میں کردار کم ہی ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانے بیانیہ ہیں۔ان کے افسانوں میں مرکزی کردار زیادہ تر مرد ہوتے ہیں۔کرداروں کے حوالے سے پیغام آفاقی نے لکھا ہے کہ:

''میں ہمیشہ ان کرداروں کے اندرون میں جا کر ان کی نگاہ سے دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں جن کرداروں کے اندر مجھے ایسی قوت چھپی ہوئی دکھتی ہے جس کو بوجوہ کبھی سامنے آنے کا موقع نہیں ملا ہے عموماً یہ وجہ باہری حالات کے نامساعد ہونے یا مناسب ماسم کی عدم موجودگی ہوتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تخلیقی شکل میں موجودہ پنہاں قوتیں تبھی باہر آتی ہیں جب باہر کی دنیا میں ان کے نمونے کا مناسب وقت آجاتا ہے۔''(اردو مابعد جدید پر مکالمہ،ص462)

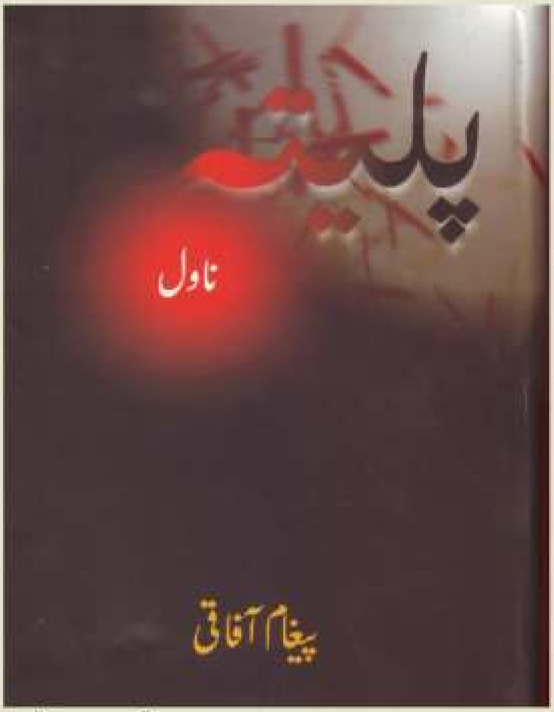

پیغام آفاقی کے یہاں ہندو مسلم،شہری دیہی،تعلیم یافتہ،غیر تعلیم یافتہ،امیر وغریب،ظالم ومظلوم،مفلس و نادار ہر طرح کے کردار ہوتے ہیں۔ان کے یہاں علامتی کردار بھی ملتے ہیں۔علامتی کرداروں کی مدد سے انھوں نے معاشرے میں پھیلی برائیوں اور ناانصافیوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ان کے علامتی کرداروں میں زرد کیڑا، کتا، بیل، درخت، ٹرین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کسی بھی تخلیق کو وجود میں لانے کے لیے کسی نہ کسی موضوع کا انتخاب پہلی اور بنیادی ضرورت ہے۔بغیر موضوع کے کوئی بھی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی ہے۔موضوع کسی بھی صنف کی روح ہوتی ہے۔جس پر فن کی تمام خصوصیات ٹکی ہوتی ہیں۔ بنیاد پائدار ہو تو عمارت بھی پائدار اور مضبوط ہوگی۔پیغام آفاقی موضوع کے انتخاب کے لئے کہیں دور نہیں جاتے بلکہ اپنے آس پاس کی دنیا کے عام فہم مسائل کو موضوع بناتے ہیں۔پیغام آفاقی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خشک موضوع کو بھی اپنے انوکھے انداز بیان اور سلیس وبامحاورہ زبان کے ذریعے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ان کے یہاں موضوع کے انتخاب اور پیش کش دونوں میں کمال احتیاط نظر آتا ہے۔انھوں

نے اپنے اطراف میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر سیاسی ، سماجی اور معاشرتی حالات و معاملات سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ان کے زیادہ تر افسانے دورِ حاضر کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔پیغام آفاقی نے اپنے افسانوں میں مختلف النوع موضوعات کو پیش کیا ہے۔موضوعات کا تنوع ان کے افسانوں کا ایک خاص وصف ہے ۔ان کے یہاں موجودہ دور کی سیاسی، سماجی و معاشی سطحوں پر ہو رہی بدکاریوں، زیادتیوں اور ناانصافیوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔طاقت اور عہدہ کا سہارا لے کر غریب اور بے سہارا لوگوں پر ظلم کرنے والوں اور رشوت لینے والے افسران پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ساتھ ہی مظلوم اور بے سہارا لوگوں کے کرداروں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں مثبت اور منفی دونوں ہی طرح کے کرداروں کو جگہ دی ہے ۔ پیغام آفاقی کی موضوعاتی کائنات بہت وسیع ہے جس میں استحصال ،دہشت گردی ،رشوت خوری ، بے روزگاری، جنسی بے راہ روی، بدلتی ہوئی حقیقت وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔پیغام آفاقی کے موضوعات سے متعلق احمد صغیر لکھتے ہیں:

''ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے اور فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں وہ اپنے افسانے کے ذریعہ نا صرف آج کے انسان کے احوال پیش کرتے ہیں بلکہ عصر حاضر کی کرب ناک گھٹن اور استحصال کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے انسانی قدروں کا جس طرح زوال ہو رہا ہے اور سماجی رشتے میں جو گراوٹ آئی ہے اس پر بھی ان کی نظر ہے۔''

(اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد،ص138)

پیغام آفاقی کے افسانوی مجموعہ ''مافیا'' میں شامل بیشتر افسانوں میں درج بالا خصوصیات ملتی ہیں ۔26/افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کو پیغام آفاقی نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصہ کو ایک عنوان دیا ہے۔ افسانہ شروع کرنے سے پہلے پیغام آفاقی نے عنوان کے ذریعے اپنے مرکزی خیال سے قارئین کو آگاہ کر دیا ہے۔ جسے پڑھ کر کہانی کو سمجھنے میں آسانی تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ افسانے کی سرخی قارئین کی دلچسپی میں اضافہ کا سبب بھی بنتی ہے۔

عصر حاضر کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا سلگتا ہوا پہلو دہشت گردی ہے جو آج ہمارے سماج کا ناسور بن چکا ہے۔آج کا سماج ان تمام پریشانیوں سے دوچار لڑ رہا ہے۔مافیا میں شامل پیغام آفاقی کا افسانہ 'مسافر' اس کی واضح مثال ہے۔ اس میں انھوں نے دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔لوگوں کا تشخص جس طرح مجروح ہو رہا ہے، شخصیتیں اپنے تشخص کے حوالے سے جس طرح حیران و پریشان ہیں،لوگوں کے سروں پر دہشت گردی کا سایہ ہمہ وقت منڈلا رہا ہے ان تمام حالات سے پیغام آفاقی بے حد متفکر نظر آتے ہیں ۔چنانچہ اپنے اس افسانے میں انھوں نے انھی حالات کو بخوبی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس افسانے کے درج ذیل چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

'' وہ اسی کشمکش میں تھا کہ اس کی نگاہ تین چار سال کی خوبصورت بچی پر پڑی ، وہ بھی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھی۔''

'' اب سب کھڑے ہو جاؤ ، پیچھے سے ایک کڑک دار آواز آئی ۔سب کھڑے ہو گئے ۔اب آگے کے دروازے سے اترو ، سب بے بسی سے ایک ایک قدم پاؤں کھینچ کھینچ کر چلتے ہوئے ،اترنے لگے ۔وہ بھی اترا اور ان میں نیچے کھڑے ہو کر شامل ہو گیا۔ پیچھے سے اور بھی مسافر اتر رہے تھے ۔اسلم نے ایک نگاہ بس پر ڈالی ۔اب وہ اداس اور بھیانک طور پر خالی تھی ۔ جیسے اجڑ گئی ہو۔''

''اب سب پیچھے کی طرف گھوم جاؤ۔''

''اب جو سکھ ہیں وہ آگے نکلیں ،اور اس سوکھے ہوئے پیڑ کے پاس جا کر دوسری طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں ۔کوئی نہیں ہلا ۔جلدی، پیچھے سے پھر آواز آئی ۔ کئی لوگ کچھ سوچ کر بالآخر آگے بڑھنے لگے لیکن تین سکھ وہیں کھڑے رہے۔ ایک مسلح نوجوان نے آگے بڑھ کر اس کی پشت پر لات ماری ۔۔۔۔''تو غدار ہے۔'' سکھ چیخ پڑا جیسے نفرت سے اس کے منہ سے تھوک آنے لگا ہو اور اس کی آواز کے ساتھ تھوک کے چھینٹے اڑنے لگے۔'' یہ ظلم ہے نوجوان ۔ یہ بہت گھٹیا کام ہے۔۔۔ یہ مسافر بیچارے ۔۔۔۔انھوں نے کیا کیا ہے۔''

(ص106،108،109)

اس افسانے میں ایک مسافر پر کیے گئے دہشت گردانہ حملے کو موضوع بنایا گیا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار اسلم کا تعلق کسی دیہات سے ہے۔جس بس میں وہ سوار ہے اس میں اور بھی بہت سے لوگ سوار ہیں جو مختلف مذہب وملت اور خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔لیکن دہشت گردوں کا نشانہ وہ لوگ ہیں جو معاشرے میں اپنی ایک خاص شناخت رکھتے ہیں۔یہ افسانہ ظلم کی بنیاد ڈالنے والوں کے خلاف نفرت کی آگ لگا کر آپ کے اندر سے شناخت نامی شیطان کو مارنے کی کہانی ہے۔اس میں انسانیت اور درد مندی کو سب سے افضل قرار دیا گیا ہے۔سب کے ساتھ رہتے ہوئے اسلم کا

اپنی جان قربان کر دینا دہشت گردی پر انسان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ افسانہ 'مسافر' کی وضاحت احمد کفیل اس طرح کرتے ہیں:

''فرقہ واریت اور دہشت گردی کے موضوع پر پیغام آفاقی کا افسانہ مسافر بھی ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار اسلم انسانیت کا علمبردار ہے جو مذہب کے نام پر انسانیت کا خون گوارہ نہیں کرتا۔''

(بہار کے چند نامور افسانہ نگار، ص269)

اس افسانہ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ دہشت گردی کو کسی ایک مذہب یا علاقے سے جوڑنا سراسر ناانصافی اور تعصب ہے۔ عصری تناظر میں اس افسانے کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

''کوآپریٹو سوسائٹی'' رشوت کے لین دین پر مبنی ایک اہم افسانہ ہے۔ موجودہ ہندوستانی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ معاشرے میں استحصال اور رشوت خوری کے واقعات بڑھ رہے ہیں اس کا واضح بیان افسانہ میں ملتا ہے۔

''مونو ایکٹر'' میں ایک انسان کو بے روزگاری سے لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کس طرح ایک انسان بے روزگاری سے مجبور ہوکر اس لالچ سے چڑیا گھر چلا جاتا ہے کہ اس کو یہاں پیسے ملیں گے۔ لیکن وہاں بھی اس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ افسانے کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بے روزگاری کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہ افسانہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ پیغام آفاقی ایک دور اندیش تھے اور آنے والے حالات کے نباض تھے۔ اقتباس دیکھیں:

''اس نے اپنی ڈگری نکالی جو ایک تختی کی طرح تھی اس پر پیچھے ایک مسلے ہوئے پھول سے لکھا ''یہ ہے ہندوستان کا گریجویٹ'' اور پھر نہ جانے کیسے وہ اندر تھا۔ دوسرے دن لوگوں نے دیکھا۔۔۔ بندروں کی صف میں ایک نئی چیز تھی اور لوگ اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ بکھرے نچے ہوئے بال، پھٹے ہوئے کپڑے، گندے پاؤں چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہوا، ہی ہی ہی ہی۔۔۔ وہ مونو ایکٹنگ کا ایکٹر۔۔۔ بندروں کی طرح ہنس رہا تھا!!!!!'' (مانیاس:165)

پیغام آفاقی نے عام، سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مشکل پسندی سے پرہیز کیا ہے۔ وہ پیچیدہ، ثقیل اور مشکل الفاظ سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جو قاری کو مشکل میں نہ ڈالیں بلکہ اس کی تفہیم اور دلچسپی کا ذریعہ بنیں۔ ان کے افسانے قارئین کے اندر اکتاہٹ اور بیزاری کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اختصار بیانی ان کے فن کا خاص وصف ہے۔ افسانہ ''کیا کہہ رہے تھے'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ محض دو صفحات پر مشتمل یہ افسانہ تین نسلوں کی عکاسی کرتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ کسی بھی مشکل بات اور واقعہ کو اس قدر آسانی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر رکھتے تھے کہ قارئین کو مشکل بات بھی بالکل آسان معلوم ہوتی ہے۔ ان کی زبان وبیان سے متعلق طارق چھتاری لکھتے ہیں:

''پیغام آفاقی کی فکر اور ان کے افسانوں کی فضا موضوعات، کردار اور مسائل کا ساتھ وہی زبان دے سکتی ہے جو وہ لکھتے ہیں۔'' (مانیا پر گفتگو، انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی)

افسانے میں خاتمہ یا انجام بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ کہانی کامیابی کی آخری منزل طے کرتی ہے۔ افسانے میں سرخی اور تمہید کے ساتھ ساتھ اختتام کا دلچسپ اور حیرت انگیز ہونا بہت ضروری ہے۔ پیغام آفاقی کے افسانوں کا اختتامیہ ہمیشہ چونکا دینے والا ہوتا ہے جو قاری کو اسی افسانے میں دوبارہ واپس لے جاتا ہے۔ ان کے یہاں انجام اچانک وارد نہیں ہوتا بلکہ قارئین خود ہی نکتہ عروج تک پہنچتے پہنچتے انجام کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ پیغام آفاقی کے افسانوں کا اختتام قارئین کو ایک نئی سوچ اور نئی فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ان کے افسانے قاری کے اندر محنت، مشقت، جدوجہد اور ظلم وزیادتی کے خلاف سینہ سپر ہونے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ پیغام آفاقی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا دلچسپ بیان ہے۔ زبان کی سادگی اور شیرینی افسانوں کے حسن کو بڑھاتی اور قاری کی دلچسپی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ خاص طور پر ان کے افسانوں کا خاتمہ بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے افسانے اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہیں۔ ان کے افسانے موضوع، ہیئت، مواد اور زبان وبیان ہر لحاظ سے ممتاز ومنفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے ایک مخصوص فکر، خاص طرز اظہار اور معاشرتی تنقید کا بہترین نمونہ ہیں۔

Rahila Parveen
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

ارم نعیم

مجروح سلطانپوری

کی شاعری میں انسانی قدریں

پورا نام اسرار الحسن خاں، مجروح تخلص تھا،19-1920 میں یو۔پی کے ضلع اعظم گڑھ کی سرزمین کو اس مایہ ناز شخصیت کی ولادت کا شرف حاصل ہوا۔ابتدائی تعلیم وہیں کے مدرسوں سے حاصل کی۔ان کے والد محمد حسین خاں ایک سرکاری ملازم تھے اور اپنے وطن سے شدید محبت کا جذبہ رکھتے تھے اس زمانے میں 1921 کی خلافت تحریک نے انھیں مغربی تہذیب سے بیزار کر دیا تھا اسی لیے انھیں کسی طرح یہ قبول نہ تھا کہ ان کا فرزند انگریزی تعلیم لے یا مغربی طرز کی طرف کوچ کرے، بلکہ ان کی یہی آرزو تھی کہ وہ مشرقی طرز پر مدرسوں میں تعلیم حاصل کریں تا کہ مذہب سے ان کے بیٹے کی قربت ہمیشہ برقرار رہیں اسی وجہ سے نو سال تک مجروح نے عربی، فارسی و اردو میں اعظم گڑھ کے مدرسوں سے تعلیم حاصل کی اور جب والد کا تبادلہ ٹانڈہ میں ہوا تو وہاں بھی سب سے اچھے مدرسے کا انتخاب کر اس میں ان کا داخلہ کروا دیا گیا۔ابھی یہ مدرسے میں زیر تعلیم ہی تھے کہ اپنی شوخ طبیعت کے باعث کسی لڑکے سے انھوں نے مذاقاً کچھ کہہ دیا، جو کہ وہاں کے اصول وضوابط کے خلاف تھا،لڑکے کو یہ بات بُری لگی اور اس نے استاد سے ان کی شکایت کر دی، چونکہ استاد مزاجاً کافی سخت تھے اور انھوں نے ان کے ساتھ بڑی سختی کا مظاہرہ کیا اور یہ بات ان کی طبیعت کو بڑی ناگوار گزری اور یہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر واپس لوٹ آئے اگر دو برس اور ان کا قیام مدرسے میں ہوتا تو یہ باقاعدہ مولوی بن کر اور عمامہ باندھ کر نکلتے،مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مجروح اپنے والد کی تنہا اولاد تھے اس لیے گھر پر ان کے تمام ناز نخرے بخوشی اٹھائے گئے اور ہر لمحہ سر آنکھوں پر بٹھایا گیا تو اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ کسی اور کی اس قدر زدوکوب برداشت کرتے۔ چونکہ انسان کے گرد ماحول کا اس کی شخصیت پر کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان میں ہمیشہ سے دوسروں سے اپنی بات منوانے کی عادت رہی، اور اس لیے جب وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تو وہاں بھی انھوں نے ڈائرکٹر کے آگے اپنی تجویز پر عمل کروایا نہ کہ ان کے حکم کی تعمیل کی، جو کہ عام طور سے فلمی دنیا میں نہیں ہوا کرتا کہ ایک نغمہ نگار کی باتوں پر عمل کیا جائے۔اس حوالے سے خود ان کا بیان پیش ہے کہ:

''اگر پھر بھی ہلکا پھلکا گیت لکھنا پڑا تو اس میں یوں کوئی بات، کوئی نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ہماری پسند چلتی تھی اکثر و بیشتر گانوں کی نہ صرف دھنیں ہم نے بنائیں بلکہ اس گیت اور کیفیت کے اعتبار سے چویشن کو ڈھال دیا کرتے ہیں اور ہماری بات ڈائرکٹر بھی مانتا تھا اس لیے ہماری عزت ہے اور تھوڑی بہت ہماری خدمت ہے۔''

(نیا سفر علی سردار جعفری و مجروح سلطانپوری نمبر، مرتبین۔ سید عاشور کاظمی، علی احمد فاطمی، جولائی تا دسمبر 2000، سرسوتی آفسٹ پریس، الہ آباد، ص۔235)

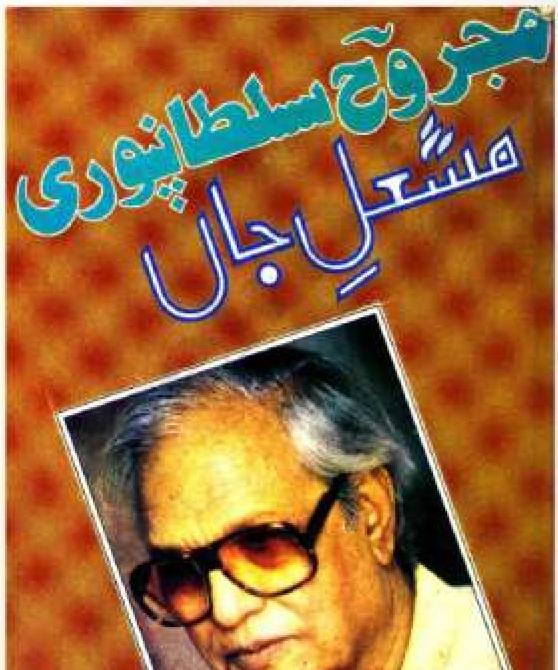

مدرسے میں پیش آئے حادثے کے بعد انھوں نے دو سال میں لکھنؤ سے طب کی تعلیم حاصل کی اور 1938 میں طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور کامیاب بھی ہوئے، ان کی قابلیت سے ان کے استاد بھی بخوبی واقف تھے۔ ادبی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت پہلے سے مجروح نے مشاعروں میں اپنا کلام پیش کرنا شروع کر دیا تھا اور اب تک وہ کافی مشہور ہو چکے تھے ان کے خوش گلو انداز کے سبب نہ صرف ان کے معترفین بلکہ ان کے مخالفین کو بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔

مجروح نے 1940 سے شعر و شاعری کی ابتدا کی 1945 میں ایک مشاعرے کے لیے بمبئی گئے اور یہی ان کی ترقی پسند تحریک اور فلمی دنیا سے وابستگی کا سبب بنا۔ 1990 تک وہ اُردو غزل اور سنیما کو اپنی خدمات سے نوازتے رہیں۔ ان کی اس پچپن سالہ محنت، جد وجہد و کاوش کے سبب ان کو اقبال سمان، غالب ایوارڈ اور دادا صاحب پھالکے جیسے انعامات دیے گئے۔ بے شک انھوں نے اس عرصے میں ادب کے حوالے سے کافی کم لکھا لیکن جو بھی لکھا بہت خوب لکھا۔ جس طرح سے صنعتوں میں صنعتِ تلمیح ایک لفظ میں پوری تاریخ سموئے رکھتی ہے ٹھیک اسی طرح مجروح کا مختصر کلام اپنے اندر بہت ساری حقیقتوں کو پنہاں کیے ہوئے ہے، اب کوئی اسے کس طرح اپنے حالات وصورتِ حال کے مطابق سمجھتا ہے یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر کرتا ہے ان کا کلام آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی ہے۔

بقول علی سردار جعفری:

''مجروح نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی خوشیوں اور ذاتی غموں کو سماجی زندگی کی خوشیوں اور غموں کے سمندر میں ملایا ہے اور پھر اس سمندر سے اپنی شاعری کے جام بھرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجروح کا ہر شعر بہ یک وقت ان کے دل کی آواز بھی ہے اور زمانے کے دل کی دھڑکن بھی۔''

(ایضاً، ص۔131)

اس لیے جب ہم کلامِ مجروح کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں ہمیں اپنی زندگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہماری اپنی بات کی گئی ہے۔ مجروح صاحب خود تو بلند ہوئے ہی ساتھ ہی انھوں نے فنِ غزل گوئی و غزل گلوئی کو بھی اعزاز بخشا، اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جبکہ سب ایک سمت پر چل رہیں تھے اور ہر طرف نظم نگاری کا بول بالا تھا انھوں نے اپنی مخالف سمت کا انتخاب کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر ارادے مضبوط و پختہ ہوں تو کوئی بھی کام مشکل نہیں، سمندر کی لہروں کے مطابق تو سبھی چلتے ہیں مگر اس کے برعکس جانے کی ہمت و جواز کسی کسی میں ہوتا ہے۔ جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ میں نے اپنی دوکان ہمیشہ بازار کی اس جانب لگائی جہاں بھیڑ اور شور نہ ہو، ٹھیک اسی طرح مجروح نے غزل کو اس وقت اپنایا جب کوئی اس کے حق میں نہ تھا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہے کہ:

''اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ مجروح سلطانپوری غزل کے ایک عمدہ طرحدار اور سجیلے غزل گو ہیں جس زمانے میں ترقی پسندی کے شور وغل میں غزل پس منظر میں چلی گئی تھی عین اسی زمانے میں انھوں نے سیاسی رمزیت اور ترقی پسند حسیت کو غزل میں کچھ اس انداز سے جذب و پیوست کیا کہ وہ غزل کے فکر و فن اور اس روشن جمالیات کا حصہ بن

گئی۔غزل کو ایک نئے آہنگ اور روایتی الفاظ وتراکیب کو
ایک نئے معنیاتی نظام سے دوچار کیا۔"

(ایضاً، ص۔165)

مجروح نے غزل کے ساتھ اپنے بزرگوں کی روایت کو بھی زندہ و پائندہ رکھا اور اس کو موجودہ وقت کے پیرائے میں برتنے کی سعی انجام دی اور اس طرح انھوں نے اپنی الگ راہ بنائی اور غزل کو پامال ہونے سے بچایا، غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ کرنے والوں کے سامنے دو مصرعوں میں اپنے مقصد کو بیان کر موضوع کا حق ادا کیا۔

یوں تو مجروح نے اپنے کلام میں کلاسیکی شعراء کی طرح محبوب کے حسن و جمال، ناز وادا، ستم و جفاؤں، زمانے کی بے ثباتی، حیات و موت کا فلسفہ پیش کیا، لیکن اس مضمون میں ہمیں خصوصاً اس سے سروکار ہے کہ کس طرح ایک طرف تو انھوں نے زندگی کے تلخ حقائق، غم اور خوشی، انسان کے عروج وزوال کا بیان کیا تو وہیں دوسری طرف انسان کے بلند و بالا مرتبے کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ مٹی کا بنا انسان کوئی معمولی شئے نہیں ہے بلکہ خداوند کریم کی سب سے اعلیٰ تخلیق ہے، کائنات کی اس قدر زیبائش و آرائش اسی کی خاطر کی گئی ہے۔یہ انسان ہی ہے جس کو کبھی فتح حاصل ہوتی ہے اور کبھی شکست۔انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی کامیابی پر تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن اپنی ناکامی پر اس سے بھی زیادہ رنجیدہ ہوتا ہے اور اسی لیے اس پر مایوسی و قنوطیت کا جذبہ غالب آجاتا ہے، تب وہ اپنے اصل مقام و مرتبے کو فراموش کر اس مقصد سے ہی مبّرا ہو جاتا ہے، جس کے لیے اسے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

روزِ ازل سے دنیا کا کارواں انسان ہی کے دم خم سے قائم ہے اگر حضرت آدمؑ دانہ گندم نہ کھاتے اور انھیں جنت سے باہر نہ کیا گیا ہوتا تو شاید آج کاروانِ دنیا یوں رواں دواں نہ ہوتی، یہ انسان ہی ہے کہ جس نے اپنی حد درجہ کوششوں سے نئی نئی ایجادات کیں۔اپنے حسنِ اخلاق، محبت وانکساری سے ایک طرف دنیا کو سنوارا، تو دوسری جانب کہیں کہیں اپنی بدمزاجی و سنگ دلی کے سبب اسے بگاڑا بھی۔

تخلیقِ انسان کے وہ چار عناصر آگ، پانی، ہوا اور مٹی اسے ہر طرح کا سلوک کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، اپنی اس فطرت کے سبب وہ کبھی محبت و نرمی کا سلوک کرتا ہے تو کبھی سختی و ناراضگی سے پیش آتا ہے، جب دوسرں کی مدد کرنے پر آتا ہے تو اس کی کامیابی و کامرانی کے لیے اس کی منزل تلاش کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے اور جب ساتھ نہ دینا ہو تو خود دوسروں کی راہ کو کانٹوں سے پُر کر دیتا ہے۔جب محبت کا ثبوت دینے پر آمادہ ہو تو تاج محل کا نمونہ پیش کرتا ہے اور عداوت نبھانی ہو تو جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اس طرح یہ تمام باتیں انسانی سرشت میں داخل ہیں وہ کبھی آسودہ حال رہتا ہے تو کبھی غمزدہ، اس کا سابقہ غم یا خوشی دونوں سے پڑتا ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فرحت وشادمانی لحاتی ہوتی ہے اس کے برعکس غم دائمی ہوتا ہے۔بزرگوں نے بھی یہی کہا کہ "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات" خوشی کا دن کب آتا ہے اور گزر جاتا ہے کچھ پتہ نہیں لیکن غم و ہجر کی راتیں کاٹنے سے بھی نہیں کٹتی اور غم کو ہی یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ جب بھی آتا ہے تو انسان کو بہت کچھ سکھا کر جاتا ہے، غم ایک شوخ مزاج انسان کو بھی اس قدر سنجیدہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنی ساری نادانی و شوخی کو فراموش کر فلسفۂ زندگی پر غور وفکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔بقول ارسطو "غم اندوزی انسان میں تہارت و پاکیزگی کا جذبہ پیدا کرتی ہے" یہ انسانی فطرت میں شامل ہے کہ اسے اس وقت تک دوسروں کی تکلیف و غم کا اندازہ نہیں ہوتا جب تک خود اس پر وہ مصیبت نہ آئے، اور تبھی اس کے دل میں دوسروں کے لیے ہمدردی و محبت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اس لیے غم و خوشی دونوں لازم و ملزوم ہیں اگر ایک نہ ہو تو دوسرے کا لطف حاصل نہ ہو بقول میر تقی میر

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
غم کے جانے کا نہایت غم رہا

کبھی کبھی یہی ہمارے جینے کا سبب بنتا ہے، لیکن کچھ غم ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو حیاتِ انساں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیتے ہیں، مجروح کی زندگی میں ایسے کئی سارے حادثات پیش آئے جس نے انھیں توڑ کر رکھ دیا مثلاً جوان بیٹے کی موت ہونا، بیوی پر فالج کا اثر ہونا، بہو کو بیوہ اور پوتے پوتیوں کو یتیم دیکھنا، کیا یہ سارے غم کسی بھی طرح کم تھے کہ اس پر زمانے کے غم جہاں سرمایہ دار اور امرا کا مزدور و نچلے طبقے کے لوگوں کا استحصال کرنا۔یہی سارے غم ہے جس کو انھوں نے اپنے کلام میں سمو لیا وہ ان کی غزل ہو یا پھر نغمے۔انسان جب درد و غم کی انتہاؤں پر ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے خالق و مالک سے اس کا شکوہ کرتا ہے۔مجروح اپنے مالک سے کہتے ہیں کہ اے خدا آج انسان ہی انسان کا دشمن بنا ہوا ہے جبکہ سب کی تخلیق تو صرف ایک خدا نے کی ہے تو پھر یہ امیر و غریب کا فرق کیوں؟ کیوں ساری تکلیف و غم کا سامنا غریبوں کو ہی کرنا پڑتا ہے؟ کیوں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے دوسروں کے سامنے دست دراز ہونے پر مجبور ہیں؟ چونکہ بڑا شاعر صرف اپنے احساسات و جذبات کو قلمبند کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے خدا سے سوال کرنے کی ہمت و جرأت بھی رکھتا

ہے اس لیے مجروح بھی اسی قسم کا استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہیں جیسے غالب نے کیا، جس طرح علامہ اقبال نے کیا۔ مجروح سوال کرتے ہیں کہ اے مالک یہ حیات وموت کا فلسفہ آخر ہے کیا؟ جب تم نے ہماری تخلیق کی تو تم ہی ہمیں مٹاتے کیوں ہو؟ جب دنیا کو روزِ ازل میں اس قدر آراستہ کیا تو پھر دنیا کا نظام اس قدر بگڑتا کیوں جارہا ہے؟ کلام ملاحظہ ہو:

مالک میں پوچھتا ہوں مجھے تو جواب دے
بہتے ہے کیوں غریب کے آنسو جواب دے
بتا مجھے جہاں کے مالک یہ کیا نظارہ دکھا رہا ہے
ترے سمندر میں کیا کمی تھی کہ آدمی کو رُلا رہا ہے
کبھی ہنسائے کبھی رُلائے یہ کھیل کیسا ہے تو بتا دے
جسے بنایا تھا اپنے ہاتھوں اسی کو اب کیوں مٹا رہا ہے

(کلیاتِ مجروح سلطان پوری، مرتب۔ تاج سعید، الحمد پبلی کیشنز، لاہور 2003 ص۔220)

اے میرے مالک آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ اس جہاں کی تمام چیزوں میں سب سے بلند وبالا مرتبہ انسانوں کو دیا گیا اور ان کو اشرف المخلوقات کے نام سے موسوم کیا گیا تو پھر زندگی بسر کرنے کے اسباب ووسائل کی تقسیم میں یہ کمی اور نہ برابری کیوں؟ جب سب کو آپ نے بنایا ہے تو سب کے دل ایک سے کیوں نہیں؟ کیوں یہ امیر وسرمایہ دار اپنے گرد پھیلے مجبور لوگوں کی مدد نہیں کرتے؟ کیا ان میں رحم دلی کا جذبہ نہیں؟ جبکہ آپ نے تو سب کو ہر جذبے سے نوازا ہے تو پھر اب یہ ناانصافی کیسی۔ اس لیے سوال کرتے ہیں کہ:

او مالک یہ انصاف کیسا ہے تیرا
کسی کو اجالا کسی کو اندھیرا
ترستا ہے کوئی خوشی کے لیے
ملا ہے کسی کو خوشی کا خزانہ

(ص۔124)

یعنی اے اللہ اس جہاں میں کسی کو تو سب کچھ میسر ہو جاتا ہے اور کسی کو کچھ بھی نہیں، اونچے طبقے کے لوگ تو اپنی بلندی وسرفرازی کا فائدہ اٹھا کر اور آگے بڑھ جاتے ہیں جبکہ غریب وکمزور لوگ ساری عمر غریب ہی رہ جاتے ہیں۔ کوئی رشوت وسودخوری سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے اور کہیں کوئی تعلیم وہنر سے پُر ہو کر بھی افلاس وپریشانی میں مبتلا ہے۔ زمانے بھر کی ستم ظریفیوں پر مجروح کس طرح اپنے رب سے اپنے احساسات و جذبات کا بیان کرتے ہیں کیونکہ جب انسان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں ہوتا تو ایسے وقت میں اسے صرف خدا ہی نظر آتا ہے، جن سے وہ اپنی ساری بات کہہ سکے، مجروح کہتے ہیں کہ

یہ رُک کے رُک کے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خُدایا غمِ زندگی نبا ہیں

(ص۔89)

آج لوگوں نے خود کو قوم وملّت اور مذہب وذات کے نام پر تو بانٹا ہی لیکن جب اس سے بھی آسودگی نہ ملی تو امیر وغریب میں بھی منقسم کرلیا، دنیا سے امن وچین کو رخصت کرنے کے پختہ انتظام کرلیے اور بے سکونی کے لیے نئی راہیں ہموار کردیں۔ ہر مذہب کو اختیار کیا لیکن مذہب انسانیت کو فراموش کردیا، انسانیت کو اپنے دلوں سے اس درجہ دور کردیا کہ جس طرح کوئی بیکار و پُرانی اشیاء کو گھر سے باہر پھینک دے، سکون وچین کو چھوڑ کر خود کو ہر لمحہ بیجا جدوجہد اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں اپنا سارا وقت صرف کرے۔ لیکن اس سب کے باوجود اب بھی مجروح موجودہ حالات سے پوری طرح مایوس نہیں ہیں بلکہ وہ اس سب سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بتاتے ہیں، کیونکہ پروردگارِ عالم نے کسی بھی انسان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی بلکہ اس کے لیے سب برابر ہیں تو پھر لوگوں کو بھی عداوت و بغض چھوڑ کر سب کو آپس میں مل کر رہنا چاہیے، چونکہ شاعر اپنے کلام ہی کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرتا ہے، اس لیے مجروح بھی اپنے خیالات و تاثرات کا اعلان کر انھیں صحیح راستے پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں، چنانچہ مجروح کہتے ہیں کہ:

بنے ہو ایک خاک سے تو دور کیا قریب کیا
لہو کے رنگ ایک ہے امیر کیا غریب کیا
وہی ہے جاں وہی ہے تن، کہاں تلک چھپاؤ گے
پہن کے ریشمی لباس تم بدل نہ جاؤ گے
کہ ذات ہے سب کی یہی، تو بات ہے عجیب کیا

(ص۔319)

اور پھر آگے کہتے ہیں کہ:

جو ایک ہو تو پھر نہ کیوں دلوں کے درد بانٹ لو
لبوں کی پیاس بانٹ لو، رُخوں کی گرد بانٹ لو
لگا لو سب کو تم گلے، حبیب کیا رقیب کیا

(ص۔319)

ان سطروں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجروح کے دل میں کس قدر خواہش تھی کہ لوگ آپس میں مل جُل کر رہیں کیونکہ جب نظامِ زندگی ایسا ہوگا تو ایک بہتر سماج ومعاشرہ تشکیل پذیر ہوگا۔ اگر انسان ہی

انسان کے لیے ہمدردی و مساوات کا جذبہ نہیں رکھیں گا تو اس میں اور دوسرے حیوانوں میں کیا فرق رہ جائے گا، محبت و حسنِ اخلاق ہر انسان میں ہونی ضروری ہے۔ انسان کی اوّل کوشش ہی یہی ہو کہ وہ اولاً معیارِ انسانیت پر پورا اُترے، باقی سب درجہ دوئم کی چیزیں ہیں، کیونکہ ہماری کامیابی سے صرف ہمیں فائدہ ہوتا ہے جبکہ ہمارے حسنِ اخلاق و انسانیت سے بہت سارے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ جب ہم متحد ہو کر ایک دوسرے کی پریشانی و تکلیف کو بانٹ لینگے تو آدھے غم تو یوں ہی مٹ جائنگے، اور جب خداوند عالم نے ہم سب کو ایک ہی خاک سے پیدا کیا ہے تو پھر اس قسم کی تفریق کیوں؟ مجروح کا یہ کلام دورِ حاضر پر کس قدر صادق آتا ہے، آج ہمارا ان باتوں پر عمل پیرا ہونا کس قدر ضروری ہے۔

حیاتِ انسانی خوشی و غم کا مجموعہ ہے درد و کلفت کی راتوں کے کالے بادل چھٹتے ہیں تو صبح کو امیدوں سے پُر ایک نیا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور یہ شعاعِ آفتاب انسان کو اپنے ماضی کو فراموش کر آگے بڑھنے کا حوصلہ و اُمید عطا کرتی ہے، اسی اُمید پر آج بھی کاروانِ دنیا رواں ہے، کیونکہ زندگی اور وقت کی گھڑیاں کسی کے لیے نہیں رُکتی اس لیے انسان کو بھی آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ بقول علامہ اقبال:

جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

اس لیے زندگی کی آزمائشوں میں مبتلا ہو کر اس میں کھو جانے کا نام زندگی نہیں ہے بلکہ ان تمام مرحلوں کو ہمت سے پار کر آگے بڑھتے جانا ہی ہمارا مقصد ہے۔ حیاتِ انسانی تو مختصر ہے اس لیے تمام غم و تکلیف کو برداشت کر آگے بڑھتے رہنا، اپنے مقاصد کی تکمیل اور منزلوں تک رسائی کے لیے کوشاں رہنا ہی انسان کا کام ہے کیونکہ زندگی تو پگھلتے موم کی مانند ہر دن کم ہوتی جا رہی ہے اس لیے جو بھی وقت ملے اسے غنیمت جاننا چاہیے۔ مجروح کہتے ہے کہ:

جیون کم ہے دور ہے منزل سپنوں میں نہ ڈول ذرا
نیند میں بیت نہ جائے عمریا آنکھ مسافر کھول ذرا
دیکھ ترے جیون کا اک دن اور ڈھلا

(ص۔190)

زندگی ہر دن موتیوں کے ہار کی مانند ایک ایک دن کم ہوتی جا رہی ہے اور یہی حقیقت ہے کہ ہر چیز جو دنیا میں موجود ہے اس کو فنا ہونا لازمی ہے، پتّے سوکھ کر پیڑ سے جدا ہو جاتے ہیں، چراغِ شب صبح ہونے تک بجھ جاتا ہے، چاہے کوئی کس قدر بھی کوشش کرلے لیکن قضا کو روک نہیں سکتا اس لیے صحیح وقت پر زندگی کی اہمیت اسکی قدر و قیمت سے واقف ہو کر اس کا بہتر استعمال کریں۔ جب یہاں مختصر وقت کے لیے آمد ہوئی ہے تو کیوں لڑائی جھگڑوں میں مبتلا رہ کر خود کو رنجیدہ رکھنا اسی وقت کو آپسی میل جول کے ساتھ اچھے سے بھی گزار سکتے ہے، مجروح اس بات کو یوں کہتے ہیں:

کوئی التجا کوئی بندگی
نہ قضا سے ہاتھ چھڑا سکا
کئے آدمی نے بڑے جتن
مگر اس کے کام نہ آ سکی
نہ کوئی دوا نہ کوئی دُعا

(ص۔192)

مجروح یہی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ موت تو برحق ہے لیکن سب اس دن سے لاعلم ہے کہ کب ان کی زندگی میں وہ دن آئے گا جب انہیں اس دنیا سے رخصت ہونا پڑے گا، تو کیوں نہ ان بچے ہوئے دنوں کا استعمال اچھے کاموں میں مثلاً لوگوں کو خوش رکھنے ان کی مدد کرنے میں کیا جائے اور ایسا کرنے سے ہمارا گھر ہمارا معاشرہ کسی جنّت سے کم نہ ہوگا۔ اور یہاں پر بھی عالمِ بالا کی فردوس کا ساسماں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ

کس نے دیکھا کس نے جانا سورگ کیسا ہوگا
اور کیسا ہوگا میرے گھر کے جیسا ہوگا
پانی کی ایک مین ہو جیسے سات سمندر
اتنی بڑی یہ دنیا اس چھوٹے سے گھر کے اندر
راجے رانیاں جس میں رہتے محل وہ کیسا ہوگا
اور کیسا ہوگا میرے گھر کے جیسا ہوگا

(ص۔244)

یعنی اگر انسان بہتر عمل کرے تو اس کا گھر ہی جنت ہے، اس کا گھر ہی وہ مقام ہے جو ساری دنیا کی رونقوں کو اپنے اندر سمیٹ کر رکھتا ہے، اور اگر اس کے گھر میں سکون موجود ہے تو اسے در در بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اس سب میں انسان کے اعمال کا بہت بڑا رول ہے اگر اس کے عمل اچھے تو سب درست اور اگر اسکے عمل ہی بہتر نہیں تو اس کے لیے یہ دنیا بھی دوزخ کے مماثل ہے اور وہ دنیا بھی، اصل سروکار تو عمل سے ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

انسان کو سب کچھ یہی پر مل جائے گا اسے کہیں بھی بھٹکنے کی ضرورت نہیں مگر بس ایک شرط پر کہ وہ حسنِ سلوک ہو، اگر اس نے اچھے کام انجام دئے تو یہیں جنت ہے اور بے جا جھگڑوں و فساد کے سبب یہی جہنم

بن جاتی ہے، بقول مجروح

یہی جہاں ہے جہنم، یہی جہاں فردوس
بتاؤ عالمِ بالا کے سیر بینوں کو
(ص۔347)

مجروح جہاں ایک طرف حیات وموت کے تناظر میں انسان کی بے بسی ولاچاری، زمانے کی ستم ظریفیوں، آپسی تفرقوں کا شکوہ کرتے ہیں تو دوسری جانب یہ بات بھی ذہن نشیں رکھتے ہیں کہ یہ حضرتِ انسان ہی ہے کہ جس کی رسائی وہاں تک ہوئی کہ جہاں فرشتوں کا گزر بھی ممکن نہ تھا، اور مٹی سے بنے اس انسان ہی کے آگے سارے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ تبھی تو اقبال نے کہا کہ:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

یعنی یہ حضرتِ انسان ہی ہے جس میں ایسی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں جو فرشتوں میں بھی نہیں، بشرطیکہ وہ خود اس کی قدر کرے اور صحیح راہ کا انتخاب کرے۔ کلام مجروح میں ایسے کئی سارے اشعار ہیں جو انسان کے مقام ومرتبے اور اس کی معراج کو ظاہر کرتے ہیں انسان کو کس قدر بزرگی حاصل ہے۔ جہاں ایک طرف سب غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ کر اس سے دور ہوئے وہی انہوں نے اپنی بات کا حق محض دو مصرعوں میں رمز وکنائے کے ساتھ اپنی بات ادا کر دی اس سلسلے میں خود ان کا اپنا بیان ملاحظہ ہو چنانچہ کہتے ہیں کہ:

"دراصل یہ وہی سہل الحصول ہونے والی صفت ہے دو مصرعوں میں ایک جہاں معنی سمو دینے والا ہنر فن شاعری میں اشاریت کا کمال ماورائیت کی حد تک دیکھنا ہے تو غزل کے علاوہ کہیں دوسری طرف نہ دیکھیے۔"

(تہذیب غزل کا شاعر، مرتبہ۔ زیبا محمود، ص۔147)

اب اسی بات کی روشنی میں ان کے وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں کہ جہاں انھوں نے غزل ہی کے دامن کو تھام کر کتنی عظیم باتیں پیش کی ہیں جو انسان کو تمام مخلوقات میں منفرد ویکتا مقام عطا کرتے ہیں۔ اشعار پیش ہیں:

ہم ہیں کعبہ، ہم ہیں بت خانہ، ہمی ہے کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجیے (ص۔343)

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

(تاریخ ادب اردو، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2003، ص۔796)

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا
(ص۔96)

میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن
صبحِ نو عبارت ہے، میرے مسکرانے سے
(ص۔211)

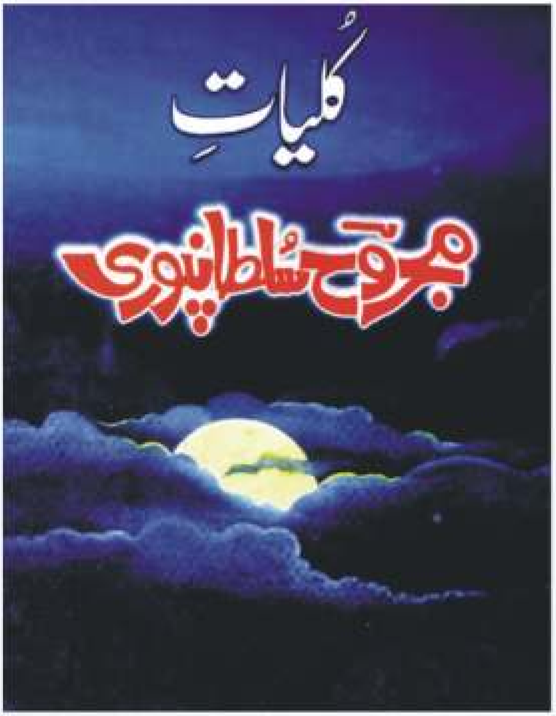

کس قدر خوبصورت وسہل انداز میں مجروح نے انسان اور اس کے مرتبے کو واضح کیا ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو پہچانے، یہ انسان ہی تو ہے جس نے اپنی کاوشوں کے سبب بڑی بڑی مہم سر کی جس کے سبب آج عالمِ بالا تک اس کی پہنچ ممکن ہوئی۔ تجسس، تحیّر وتفکر کے سبب وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اسی کے دم خم سے اس بزم گیتی میں رونق ہے اس کے ہاتھوں کی جنبش نے بے جان اشیا میں بھی جان ڈال دی، پہاڑوں کو کاٹ کر راستے بنائے، بنجر زمیں کو سر سبز وشاداب کیا، ویرانوں کو آباد کیا یہ سب دیکھ کر علامہ اقبال کو کہنا پڑا کہ:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وزاغ آفریدی
خیابان وگلزار وباغ آفریدم

اور اس سب کے پیچھے ایک ہی اصول وجذبہ کارفرماں تھا اور وہ تھا محنت، جستجو، اپنی منزل کو پانے کی چاہ، اپنے مقصد سے عشق وجنون اور وہ خود کو ہر وقت نئی کوششوں میں سرگرداں رکھتا تھا ایک مقام کے ملتے ہی دوسرے کے لیے جدوجہد کرتا تھا اور یہی صحیح بھی ہے کہ انسان ہر وقت کوشش پیہم میں رہ کر اپنی منزل کو حاصل کرے۔ بقول مجروح:

ہیں اس کشاکش پیہم میں زندگی کے مزے
پھر ایک بار کوئی سعی نا تمام کریں

(ص۔201)

اور اپنی منزل کے راستے میں آنے والی ان تمام رکاوٹوں کی فکر سے بالاتر اپنے کام کو ایمانداری سے کرتے رہنا چاہیے اسی مسلسل کوشش میں ہی زندگی کا اصل لطف موجود ہے ۔ لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہ کریں کیونکہ نکتہ چیں اپنے بیجا مشورے وتجویز دے کر لوگوں کو گمراہ کر دیتے ہیں اس لیے ایسی فکر سے آزاد رہ کر اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے کیونکہ مسلسل کوشش کرنے والے کو ایک دن اس کا اجر ضرور ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروح
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو

(ص۔92)

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنی روایات کے منکر نہیں ہیں مگر انھوں نے اپنی الگ روش اختیار کی، ہر بات کے مثبت ومنفی دونوں پہلو ہوتے ہیں جس میں انھوں نے مثبت ہی کا انتخاب کیا، جس کی وضاحت کے لیے وہ کبھی آپسی میل جول سے رہنے کے مفاد سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں تو کبھی حضرتِ انسان کے بلند وبالا مرتبے کا بیان کرتے ہیں نہ کہ اس کی خامیوں کا۔ تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ ان کی زبانی سنیے:

ہم روایات کے منکر تو نہیں ہیں لیکن
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

(ص۔180)

یعنی اگر سارے لوگ ایک ہی راستے پر چل رہیں ہوتو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ صحیح بھی ہوں اس لیے حق اور باطل کی شناخت کرنا سیکھیں دوسروں سے انکساری والفت کا رویہ رکھیں تا کہ آپ کو بھی بدلے میں وہی ملے۔ مثلاً

ہم ہے راہی پیار کے ہم سے کچھ نہ بولیے
جو بھی پیار سے ملا ہم اسی کے ہو لیے

(ص۔197)

جہاں سے بھی انسان کو محبت والفت ملے اسے وہاں کا ضرور ہونا چاہیے اور دوسروں کے اس جذبہ خلوص کے لیے ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ کلامِ مجروح کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات کے ساتھ زندگی کے سب سے ضروری موضوع یعنی خوشی و غم، فلسفۂ حیات و موت، انسانی قدریں ، دنیا میں اس کی اہمیت و افادیت، ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کی ضرورت، اخوت ومحبت کو کتنے سہل انداز میں بیان کیا ہے۔ جو بظاہر تو دیکھنے اور کہنے میں بڑے آسان معلوم ہوتے ہیں مگر انھیں اپنی زندگی میں برتنا اتنا ہی مشکل ہے اب وہ ان کے گیت ہو یا غزل ہر جگہ وہ لوگوں تک اپنا پیغام رسا کرتے نظر آتے ہیں، کلام مجروح کا مطالعہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ یہی ان کی زندگی کا نصب العین بن گیا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کی حقیقت سے آشنا کرائیں اور انھیں اس سمت راغب کریں کہ جس کے لیے انھیں یہاں بھیجا گیا اور آج ان کا یہ پیغام لوگوں میں عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس دنیا میں آکر اپنے مفاد کے لیے کوشاں رہنا ہی زندگی نہیں ہے بلکہ کبھی اس بھاگ دوڑ میں لمحہ بھر رُک کر دوسروں کے متعلق سوچنا ان کے لیے کچھ کرنا بھی ہمارا فرض ہے ، ورنہ ہم میں اور دوسرے حیوانات میں کیا فرق رہ جائے گا۔

آخر میں ان کے اس شعر پر اپنے مضمون کا اختتام کرتی ہوں کہ جس نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا کیا جسے پڑھ کر اولاً تو مجروح کی طرف خیال جاتا ہے کہ انھوں نے یہ شعر اپنے لیے کہا، دوسری طرف حضرت آدمؑ کا وہ طویل وتنہا سفر یاد آتا ہے جس کی ابتدا انھوں نے اکیلے کی اور ایک عرصے تک وہ اس جہاں میں اکیلے رہیں اور پھر رفتہ رفتہ دنیا کا کارواں آگے بڑھتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ دو مصرعے ہمیں اپنی منزلوں کو حاصل کرنے اور آگے بڑھتے جانے کا حوصلہ اور درس دیتے ہیں:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

□□□

Iram Naim
Research Scholar
Dept. of Urdu
Allahabad University
Prayagraj-202001(U.P)

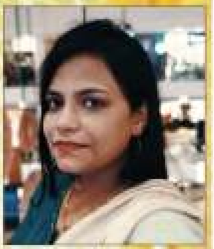

صبا

عابد سہیل کے افسانوں میں
فسادات کا ذکر

عابد سہیل ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ ایک باکمال افسانہ نگار تھے۔افسانہ کے علاوہ انھوں نے خاکے اور خودنوشت لکھ کر بھی گلشن ادب کی آبیاری کی،صحافت اور ترجمہ بھی ان کے میدان رہے ہیں جہاں انھوں نے ادب کے بہتر نمونے پیش کیے۔نصرت پبلشرز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور تیرہ برسوں تک ایک معیاری رسالہ''کتاب'' شائع کرتے رہے۔

عابد سہیل اترپردیش کے مقام اورئی ضلع جالون میں 27 نومبر 1932 کو ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات 16 جنوری 2016 کو ممبئی میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اورئی میں ہوئی،اس کے بعد بھوپال آگئے جہاں سے انھوں نے 1948 میں ڈی اے وی اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا اور اس کے بعد لکھنؤ سے بی اے اور ایم اے پاس کیا۔عابد سہیل کی بنیادی شناخت ایک صحافی اور افسانہ نگار کی ہے۔ وہ ایک ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔

عابد سہیل کی زندگی میں ان کے تین افسانوی مجموعے''سب سے چھوٹا غم'' ''جینے والے'' اور''غلام گردش'' شائع ہوئے تھے۔ان کے انتقال کے بعد ان کی بیگم نصرت عابد سہیل نے''افسانیات'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی،جن میں عابد سہیل کی متفرق تحریریں شامل ہیں ان کے افسانوں کی تعداد تقریباً 44 ہے۔'سب سے چھوٹا غم' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں 16 کہانیاں شامل ہیں۔دوسرا''جینے والے'' جس میں 14 افسانے اور''تیسرا غلام گردش'' جس میں 11 افسانے شامل ہیں۔مذکورہ تمام افسانے نصرت پبلشرز نے شائع کیے۔ ان کے افسانوں کی ابتدا کے بارے میں پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''عابد سہیل نے افسانہ لکھنا اندازاً 1948 سے ہی شروع کر دیا تھا۔اس لیے کہ ان کی پہلی کہانی اگست 1949 میں دیوان سنگھ مفتون کے رسالے''ریاست'' میں شائع ہوئی۔جس کا عنوان''دورآسمانوں کی خلاؤں میں'' تھا۔ جو لوگ دیوان سنگھ مفتون اور''ریاست'' سے واقف ہیں ان کو اس کا اندازہ ہوگا کہ''ریاست'' میں کوئی کمزور تحریر نہیں شائع ہوئی تھی اس لیے عابد سہیل کو بیانیہ اور ماجرا سازی پر اتنی گرفت ضرور ہوگئی تھی کہ ان کی کہانی کسی معتبر جریدے میں شائع ہوسکے۔''

(عابد سہیل ایک منفرد افسانہ نگار،پروفیسر شارب ردولوی،نوائے رفتگاں نمبر،اگست ستمبر 2016 لکھنؤ،ص73)

مذکورہ اقتباس سے عابد سہیل کی افسانہ نگاری کا اندازہ ہوتا ہے

کہ انھوں نے اپنی افسانوی زندگی کی شروعات کس طرح کے افسانوں سے کی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ عابد سہیل نے افسانہ کے علاوہ صحافت میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ چنانچہ 20 سال کی عمر میں یعنی 1952 میں قومی آواز سے وابستہ ہوگئے۔ صحافت ان کے رگ وپے میں بسی ہوئی تھی۔ اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

''لکھنا پڑھنا میرا شوق رہا اور اپنے شوق کا بکھان کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن صحافت (Journalism) میری دو وقت کی روٹی تھی۔ سو میں نے اپنی محنت مزدوری کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور یہ بھی تو دیکھئے کہ میں نے صحافت کن لوگوں کے قدموں میں بیٹھ کے سیکھی؟ ان میں سے ایک تھے حیات اللہ انصاری جن کا ادب میں بڑا مان دان ہے اور دوسرے ایم چلپت راؤ جن کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بات اور اس وقت ادب اور صحافت پر Values کی حکمرانی تھی۔''

(عابد سہیل بزبان خود، نیا دور، لکھنؤ، اگست ستمبر 2016، ص96)

عابد سہیل کی صحافتی زندگی کا ادبی چہرہ ان کا رسالہ ماہنامہ ''کتاب'' ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی منقسم رہی۔ ایک خالص ادیب دوسرا خالص صحافی ان کی شخصیت ان دو اہم خصوصیات کے ساتھ بٹی رہی ان دو خصوصیات کے علاوہ تنقید نگاری، خاکہ نگاری اور ترجمہ نگاری سے بھی شغف رکھتے تھے اور عمر کے آخری ایام میں ''جو یاد رہا'' کے نام سے ایک خودنوشت بھی لکھی، صحافت ان کا پیشہ تھا اور یہ کام روزی روٹی کے لیے کرتے تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ ان کی پیشہ ورانہ زندگی تھی۔ لیکن وہ ادب کو جیتے تھے اور ادب کے لیے جیتے تھے خاص طور سے افسانہ کے لیے۔ اس لیے ان کے قلم کا اصل جوہر افسانے میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک صحافی ہوتے ہوئے ان کی روح افسانے میں بسی رہتی تھی اور سماج کی اصل عکاسی اسی میں اصل طریقہ سے ممکن ہو پاتی ہے۔ ڈاکٹر مسرت جہاں اپنی کتاب ''عابد سہیل کے افسانوں میں عصری حسیت'' میں لکھتی ہیں کہ ''انھوں نے شدت پسندی سے ہمیشہ گریز کیا اور حقیقت پسندی کو اپنی تخلیقات کا شیوہ بنایا سو عابد سہیل نے اپنے وقت کے عصری تقاضے کے مطابق مختلف موضوعات پر افسانے لکھے جس میں مذہب اور مسلک انسانی بے حسی، نفس پرستی، تہذیبی اقتدار کا زوال طبقاتی کشمکش اور بے جوڑ شادی سے پیدا شدہ مسائل کو خصوصی توجہ دی ہے۔ مذکورہ تمام موضوعات سے قطع نظر ہم اس موضوع کا احاطہ کریں گے جس کا ذکر عابد سہیل کے کئی افسانوں میں آیا ہے اور یہ آج کا سلگتا ہوا موضوع ہے جس میں شرطیں، سوا نیزے پر سورج، روح سے لپٹی ہوئی آگ، دستک کس دروازے پر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ویسے برطانوی حکومت کا ہندوستان میں برسراقتدار آنے سے ملک کی آزادی تک اور اس کے بعد بھی آج تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکا، 1857 کی بغاوت میں فساد، آزادی کی لڑائی میں فساد، اور ملک کے تقسیم ہوتے وقت فساد، یا بہار کا بھاگل پور فساد ہو یا مظفر نگر یوپی کا فساد ہو سب ہمارے سامنے ہے۔

اگر آج انسان کے ذہن کی طرف توجہ کی جائے تو تحت الشعور میں چاروں طرف افراتفری کا ماحول دکھائی دیتا ہے۔ عابد سہیل کے افسانوں میں آزادی کے بعد ہو رہے فسادات کا ذکر ہے جس میں ''سوا نیزے پر سورج'' سب سے اہم ہے یہ ایک رونگٹے کھڑا کر دینے والا افسانہ ہے۔ افسانہ کی ابتدا ہلکی سی مسکراہٹ سے ہوتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''میری بڑی بیٹی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی میں نے پوچھا، کھیل چکی؟''

''کیا کھیلیں'' اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر جھلا دیے۔

اس افسانے میں بظاہر بچوں کے کھیل ہیں جو بچے چھٹیوں کے بعد کھیلتے ہیں لیکن بچوں کے ساتھ جو مکالمہ ہے وہ بچوں کی نفسیات کا پتہ دیتا ہے کہ ایک گھر میں دو چار بچے ہوں تو کس طرح کا ماحول ہوتا ہے لیکن اس افسانے کی جو آخری لائن ہے وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہانی یہاں بظاہر ختم ہو جاتی ہے لیکن ایک ٹریجڈی یہاں سے شروع ہوتی ہے، عام طور سے کہانی کا کلائمکس بیچ میں کہیں سے ہوتا ہے لیکن اس افسانے کا یہ امتیاز ہے کہ آخری لائن ہی اس کا کلائمکس ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''ہم لوگ شیعہ سنی کا کھیل کھیل رہے ہیں،، اسی سے کہانی ختم ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر محمد حسن اس کہانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عابد سہیل کا دوسرا افسانہ سوا نیزے پر سورج، پڑھا جس نے گویا دامن دل کھینچا۔ زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہو رہے تھے مگر بھلا کسے خیال تھا کہ اس قسم کے فساد بھی افسانے کا موضوع بن سکتے ہیں اور وہ بھی ایسے دل دوز افسانے کا موضوع جو بقول شخص مدتوں تڑپاتا رہے۔ سچ پوچھئے تو یہ افسانہ جس اہتمام حسن نزاکت احساس اور جس دردمندی سے لکھا گیا ہے وہ اردو

افسانے کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔سب سے الگ راہ، سب سے جدا روش، ایسا افسانہ جسے پڑھ کر افسانے کا نہیں اردگرد بکھری ہوئی پارہ پارہ زندگی کا خیال آتا ہے۔"

محمد حسن کا مذکورہ اقتباس صرف اس افسانے کے موضوع سے بحث کرتا ہے کرداروں سے بحث نہیں کرتا یہ اقتباس ایک تاثر ہے۔اس افسانے کا مرکزی خیال اس افسانے کا کردار ہے جو کہ بچے ہیں اور اصل میں تین بچوں کے اطراف کہانی گھومتی رہتی ہے یہ تینوں بچے اپنے گھر کے اندر کھیلتے ہیں لیکن جو شیعہ سنی فساد لکھنؤ میں اس وقت ہو رہا تھا اس سے ان بچوں کا ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا اور اس فساد کو بچے کھیل کی شکل میں کھیلتے ہیں جسے آپ ایک طرح کا (Play) کہہ سکتے ہیں۔بچوں کے ذہن پر پڑنے والے اثرات جو ایک چھوٹے سے کھیل کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں اس سے بچوں کی ذہانت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اگر کرداروں کی بات کی جائے تو فوزیہ کا کردار سب سے چنچل دکھائی دیتا ہے وہ اپنے ابو کے ساتھ جو مکالمہ کرتی ہے وہ لاجواب ہے اور اپنے ابو کی ہر بات کا جواب بڑی تیزی سے دیتی ہے۔اقتباس دیکھئے:

"فوزیہ نے پتیلی پر سے طشتری اٹھا کر چمچے سے ایک آلو نکالا اور اسے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے دبا کر دیکھا اور بولی۔"ابھی تھوڑی سی کسر ہے۔" تو شگوفہ نے گڈے گڑیا کی طرف دیکھ کر کہا: ابھی کھانے میں تھوڑی دیر ہے، آپ لوگ جب تک ناشتہ کیجیے میں اپنی ہنسی بہ مشکل ضبط کر سکا۔وہ اپنے کھیل میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں اس بات کا اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں، ورنہ فوزیہ وہیں سے کہتی "ابو اللہ آپ اندر جائیے۔دیکھئے ہم آپ کا کھیل نہیں دیکھتے ہیں۔"

اس طرح سے زیر بحث افسانے میں دو طرح کی کیفیات کا ذکر ہے ایک تو بچوں کا اپنا کھیل جس میں لوڈو، کیرم اور سب سے دلچسپ اور پسندیدہ کھیل گڈہ اور گڑیوں کا کھیل لیکن اس کھیل میں تبدیلی تب آتی ہے جب وہ شیعہ اور سنی کا کھیل کھیلنے لگتے ہیں ابتدا میں افسانہ کے مطالعہ سے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع فساد ہے لیکن آخری لائن افسانے کا مزاج اور موضوع سب کچھ بدل دیتی ہے شاید یہی اس کی خوبی ہے۔

اسی ضمن میں لکھا گیا دوسرا افسانہ 'روح سے لپٹی ہوئی آگ' بھی فساد سے تعلق رکھتا ہے افسانے کا انداز بیانیہ ہے اور اس کی ابتدا علامتی انداز سے ہوتی ہے اسے (لکھنؤ کے نام) لکھا گیا ہے جس میں فرقہ پرستی اور منافرت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے فساد کے بعد جو نقصانات ہوتے ہیں اور اس کے بعد کے جو اثرات ہوتے ہیں یہ ساری چیزیں اس افسانے کا مرکزی خیال ہیں۔ذیل میں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"چند گھنٹوں، بلکہ چند لمحوں نے ان کی عمروں سے کم سے کم بیس بیس برس چھین لیے۔ایک نسل جوان ہو گئی، ایک نسل بوڑھی ہو گئی، ایک نسل قبر کی گود میں اتر گئی، سنسان سڑک، لٹی ہوئی دکانیں، بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے شیشے کے برتن، ہزاروں من لکڑی جو کوئلہ تھی نہ راکھ، فائر بریگیڈ گشت لگاتی ہوئی پولیس کی ٹکڑیوں کے بوٹوں کی آواز۔"

(عابد سہیل: سب سے چھوٹا غم، لکھنؤ نصرت پبلشرز، ص78)

مذکورہ اقتباس سے عابد سہیل کی شدت اظہار کا اندازہ ہوتا ہے اور قلم کی روانی کا اور بیان میں تسلسل کا بھی اور فساد میں ہو رہے جان و مال کا کے نقصان کا بھی۔اس چھوٹے سے اقتباس نے افسانہ کا پورا منظر نامہ بیان کر دیا ہے اور فساد سے ہو رہے نقصانات کا ذکر بھی اس افسانہ میں موجود ہے جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ اس افسانہ کا انداز بیانیہ ہے، پیشکش علامتی ہے۔کرداروں میں کوئی خاص کردار نہیں ہے جس کا تجزیہ کیا جائے بس ایک سپاٹ اور سیدھے انداز میں لکھنؤ میں ہو رہے فساد کو اس افسانے کا اصل موضوع بتایا گیا ہے اس کے علاوہ اس افسانے کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ کس طرح سے اخبار میں لوگ فساد کی خبروں کو غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں اور اس کے اثرات بچوں کے ذہن پر کس طرح سے پڑتے ہیں ذیل میں ایک دوسرا اقتباس دیکھئے:

"ابو ابو" میری بیٹی نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا، گولی چل گئی بہت سے لوگ مارے گئے۔ کہاں؟ میں ہنسا۔اس کے ذہن سے خطرہ دور کرنے کے لیے میں نے کہا، کہیں تو گولی نہیں چلی، نہیں ابو آپ کو معلوم نہیں رکشہ کہہ رہا تھا۔کہیں گولی چلی ہے، نہیں بیٹی کہیں گولی نہیں چلی میں نے کہا۔نہیں ابو، میری سات آٹھ سال کی بچی کو اپنی معلومات صحیح ہونے پر

اسرار تھا۔

(عابد سہیل: سب سے چھوٹا غم، لکھنؤ نصرت پبلشرز، ص80)

عابد سہیل کا اندازہ صحیح ہے کہ وہ منظر کشی کے درمیان تمام اہم چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور اس کے اثرات کو بھی بیان کر دیتے ہیں اس اقتباس میں خاص بات یہ ہے کہ ایک بچہ اپنے ذہن پر کس طرح کے نقوش ثبت کرتا ہے جب اس کے ارد گرد بہت کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ بچہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے کتنا باخبر رہتا ہے۔

عابد سہیل کا افسانہ 'دستک کس دروازے پر' بھی فساد کے موضوع پر لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے۔ مذکورہ افسانہ تین کرداروں کے اطراف گھومتا ہے لیکن مصنف نے کردار سے زیادہ موضوع کو اہمیت دی ہے، داؤد اور روبینہ بچوں کو احتیاط کے طور پر اپنے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اکیلے رہنا پسند کرتا ہے بیوی بچے ڈرے سہمے ہوئے ہوتے ہیں اور داؤد نارمل رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ امیش اور داؤد گہرے دوست ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ بھی ہے تاہم احتیاط وقت کا اہم تقاضہ بن گیا ہے۔ دونوں دوستوں کے درمیان غیر محسوس طریقے سے دراڑ پڑ گئی ہے مگر دونوں نبھا رہے ہیں۔ ذیل کے اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

'' اس نے ایک بار بھی نہیں کہا،، ارے بیٹھو، دس منٹ بعد چلے جانا،، امیش بھی اپنی عادت کے برخلاف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ نہیں کہ بار بار، بس اب چلا کہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے امیش نے صرف ایک جملہ کہا،، میرے ہی گھر پہنچا دیتے۔

(عابد سہیل: غلام گردش، لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ص ۴۰)

عابد سہیل نے اس افسانہ میں کسی بڑے ہنگامہ یا دیگر مالی نقصانات کا ذکر نہیں کیا ظاہر ہے ہر افسانہ میں ایک ہی بات کو بیان نہیں کیا جا سکتا ہے فساد میں تو ہر طرح کے نقصانات ہوتے ہیں لیکن اس افسانہ میں جو سب سے اہم ہے وہ ہے دوستی، دو دوستوں کے درمیان کے احساسات جب کے دونوں دو مسلک کے ہوں اور دو نظریہ فکر کا ہو ایسے میں دوستی کس طرح برقرار رہ سکتی ہے اسی کیفیت کو اس افسانہ میں بیان کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی آتے جاتے ہیں لیکن جب فساد کا ماحول بنتا ہے تو دونوں کے احساسات بدل جاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے حوالے سے مطمئن نہیں رہتے۔ فساد نے سماجی رشتوں کو کافی نقصان پہنچایا ہے اکثریت اور اقلیت کا معاملہ بڑا ہی سنگین ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود دل کے اندر جو احساس ہے وہ کبھی بھی فساد والے احساس سے خالی نہیں رہتا۔ دوستی خواہ کتنی بھی گہری ہو جائے لیکن دل کبھی بھی ایک دوسرے کے حوالے سے مطمئن نہیں رہ سکتا یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں یہ آپسی ہم آہنگی بہت اچھی ہے لیکن دل کا خوف جاتا نہیں۔

فسادات کے ردعمل اور فرقہ وارانہ عصبیت سے ذہنوں کا موسوم ہو جانا فطری بات ہے اردو افسانے نے اس عصبیت کی خوب عکاسی کی ہے۔ فسادات پر افسانہ لکھنے کے اس ہمہ گیر رجحان نے افسانہ نگار کے لیے ایک مسئلہ بھی پیدا کر دیا۔ فسادات کا موضوع افسانے کے لیے بہت جاندار اور سازگار نہ سہی لیکن یہ بہت وسیع موضوع بھی نہیں تھا باوجود اس کے فساد جیسے موضوع پر منٹو کا ''کھول دو'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' راجندر سنگھ بیدی کا ''لاجونتی'' اور قدرت اللہ شہاب کا ''اور عائشہ آ گئی'' انتظار حسین کا ''ہندوستان سے ایک خط'' وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ فسادات ہندوستان کا اہم مسئلہ رہا ہے۔ ان فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کو سیاسی وسماجی انتشار اور تہذیبی و اخلاقی انحطاط کی عمیق گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے ان خون آشام اور لرزہ خیز مناظر نے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جس کے نتیجہ میں فسادات کے موضوع پر لاتعداد افسانے لکھے گئے لیکن آزادی کے 70 سال گزرنے کے بعد بھی فسادات اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔

ان فسادات نے روح کو ایک اذیت ناک تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ دراصل عابد سہیل کے افسانے عام انسانوں کی زندگی کے مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں جنھیں وہ بیان کرتے ہیں لیکن وہ ان کے سامنے ایک سوالیہ نشان بنا کر قاری کے لیے چھوڑ بھی دیتے ہیں تا کہ قاری یہ فیصلہ کر سکے کہ بین السطور میں کون سی حقیقت پوشیدہ ہے اور کس معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔

□□□

Saba
Research Scholar
House No. 356A
Street No:22B
Zakir Nagar
Jamia Nagar
New Delhi-110025

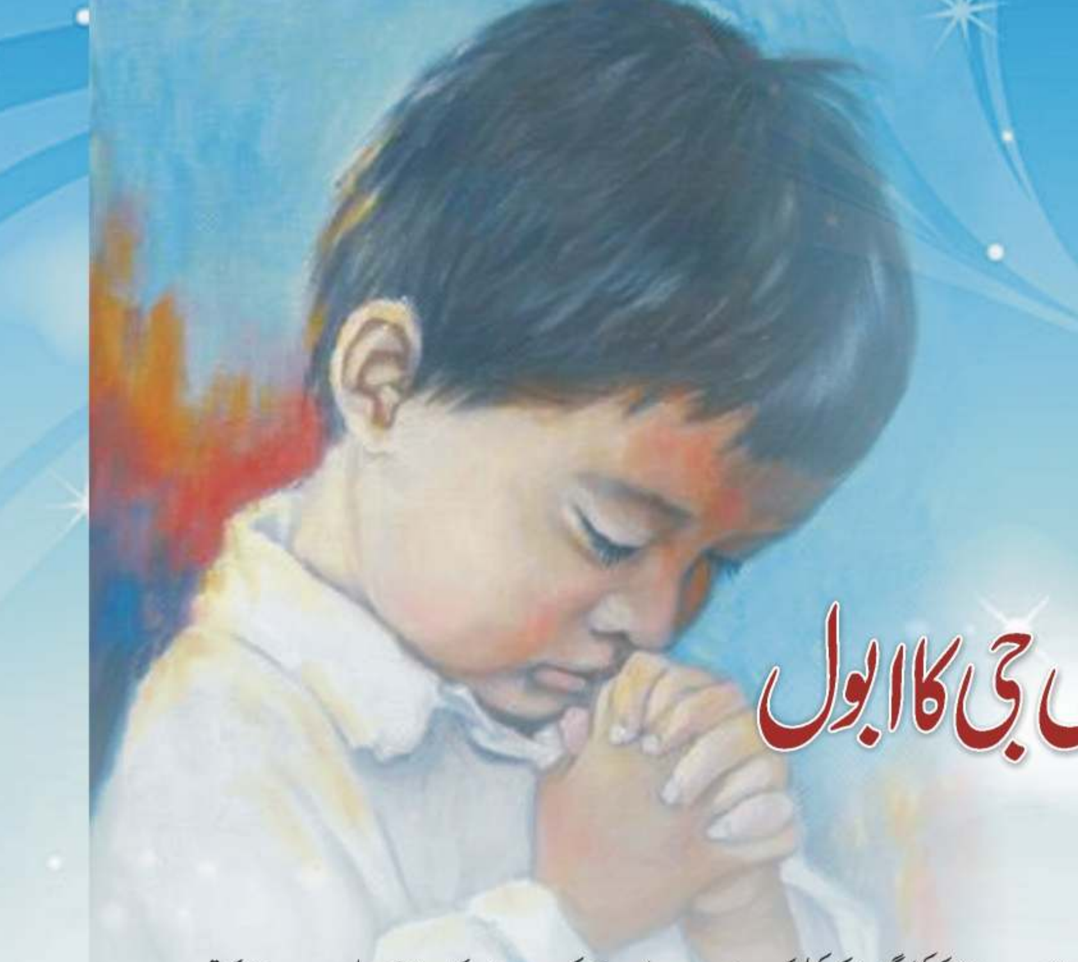

شیریں نیازی

اماں جی کا ابول

تیسرا پہر رہا ہوگا جب میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ آنگن سے باتیں کرنے کی تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں جن میں گھر کے لوگوں کے علاوہ ایک اجنبی آواز بھی شامل تھی۔ ایسی جیسی سیلس مین اپنا پروڈکٹ بیچنے کے لیے گاہک کو کنوینس کرنے کے واسطے اپنے اندر کی تمام آوازیں یکجا کر کے انھیں قائل کرنے اور سمجھانے کے لیے کیا کرتے ہیں۔

میں آج ہی صبح علی گڑھ سے آیا تھا۔ یونیورسٹی میں ایک ہفتے کی چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ چناؤوں کا موسم آ گیا تھا۔ ریزرویشن نہ مل پانے کی وجہ سے جنرل ٹکٹ لے کر چلنا پڑا۔ سفر بڑا تکلیف دہ تھا۔ ٹرین بھی چار گھنٹے لیٹ تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے تھک کر چور ہوگیا۔ آتے ہی بستر پر لڑھک گیا تھا۔

کافی دنوں سے باہر رہنے کے باعث میں گھر کے معاملات میں دخیل نہیں تھا۔ اس کے باوجود آوازیں سن کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو سوچا کہ کوئی پھیری والا ہوگا جو اپنے کپڑے بیچنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے یا کوئی سبزی ترکاری والا۔ لیکن اب سے پہلے اماں نے کبھی کسی پھیری والے کو آنگن میں نہیں بلایا تھا۔ پڑوسی ہو تو اور بات ہے وہ تو گھر میں آئیں گے ہی۔

جب سے باہر جا کر پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا تھا، میں گھر میں مہمان سا ہوگیا تھا۔ سال چھ مہینے بعد دو چار دن کے لیے آتا تو اماں طرح طرح کے پکوان بنانے اور کھلانے کے لیے دن رات ایک کرتیں۔

چند مہینے پہلے بڑے بھیا بھی روزی روٹی کے چکر میں باہر چلے گئے تھے۔ اماں کی طبیعت خراب رہتی تھی پھر بھی دن رات گھر کے کاموں میں الجھی رہتی تھیں۔ اس گھر میں اماں کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ باہر سے سودا سلف لانے والے کی سخت ضرورت تھی جو کہ اب تک نہیں ملا تھا۔ مجبوری میں باہر سے سامان لانے کے لیے بھی خود اماں کو ہی جانا پڑتا تھا۔

آنگن میں آ کر میں نے دیکھا ایک آدمی آٹھ نو سال کے ایک بچے کو کام پر لگانے کے لیے لے کر آیا ہوا ہے۔ جبکہ اماں کسی ادھیڑ عمر کی عورت کو رکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ شخص اس بچے کے لیے ہی دلیلیں دیتا جا رہا تھا۔

ہمارا یہ مکان پرانے طرز کا بنا ہوا تھا۔ پہلے داخلی دروازہ پھر مردانی بیٹھک۔ پھر دالان اس کے بعد بڑے سے آنگن کے ایک کونے پر کنارے گلاب، بیلے جوہی اور رات رانی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے جا کر کچن گارڈن تھا جہاں دادی اماں نے کچھ پودے سبزی ترکاری کے لگا رکھے تھے۔ کھیرے، کریلے، بینگن ٹماٹر دھنیا وغیرہ۔ ان پودوں کی دیکھ بھال خود دادی اماں کیا کرتی تھیں۔ گرمیوں کے موسم میں کچے آنگن میں شام کے وقت چھڑکاؤ کیا جاتا تھا اور سارا ماحول سوندھی سوندھی خوشبو

سے مہک اٹھتا تھا۔ مغرب بعد سے رات کی رانی خوشبو بکھیرا کرتی چاندنی کھل اٹھتی اور چاند کی مدھم دودھیا روشنی پورے آنگن میں پھیل جاتی اور آنگن میں بچھی چارپائیوں پر گھر کے سارے بچے قبضہ جما کر بیٹھ جاتے۔ دادی اماں بیچ میں ہوا کرتیں اور ہم لوگ دادی اماں سے پیاری پیاری کہانیاں سنا کرتے۔

کچھ برس پہلے ہماری دادی اماں جنت کی پریوں کی کہانیاں سنانے جنت کے آنگن میں جا بیٹھی۔ ہمارے بچپن نے جوانی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

ہمارے سروں پر پڑھائی لکھائی کا وزن بڑھ گیا۔ پڑھائی کے لیے باہر جانے کے بعد ہماری چھوٹی بہن باہر کے سارے کام کرنے لگی۔ پڑھنے میں بھی تیز تھی اور ایک مقامی کالج سے گریجویشن کر رہی تھی۔

لیکن پاس پڑوس والوں کو لڑکی کا سبزی ترکاری راشن پانی لانا اچھا نہیں لگا۔

''معصوم آنکھوں اور گول مٹول چہرے والا ایک وجود میرے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات مچل رہے تھے شاید اسے کوئی خوب صورت پرندہ کسی شاخ پر بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ایک انگلی اٹھائی اور ہونٹوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایسے جیسے ایک اجنبی نہ ہو کر میں اس کے بچپن کا دوست ہوں''

اس بات پر اماں جھلا بھی گئیں۔ ''جو لوگ کہتے ہیں وہ میرے کام کر دیا کریں تو ہمیں لڑکی کو باہر بھیجنے کی ضرورت ہی کیوں پڑے؟ بولو۔ ''کروگے میرا کام؟'' اس بات پر سبھوں نے چپی سادھ لی۔

پھر اماں نے آہستہ آہستہ خود ہی روبینہ کو باہر بھیجنا کم کر دیا اور سبزی ترکاری کے لیے بھی خود ہی جانے لگیں۔ اس طرح اماں کا کام اور بڑھ گیا۔ بیمار ابا کی دیکھ بھال بھی انھیں کو کرنی پڑتی تھی۔ ایک وقت کھا کر وہ دن رات کام میں جٹی رہتی۔ اماں کی تکلیف دیکھ کر کبھی کبھی میرا دل کرتا کہ پڑھائی چھوڑ کر گھر آ جاؤں لیکن کل؟ کل کیا ہوگا؟ پڑھے لکھوں کو تو نوکری ملتی نہیں۔ جاہلوں کو کون پوچھے گا بھلا۔

کافی دیر کی بات چیت کے بعد اماں اس بچے کو کام پر رکھنے کے لیے تقریباً راضی ہو گئی تھیں۔ پھر بھی مجھے سامنے دیکھ کر انھوں نے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور میری رائے جاننا چاہی۔

میں نے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جس کے رکھنے کی بات ہو رہی ہے وہ ہے کون؟ پھر اچانک میری نظر آنگن کے پچھواڑے کھلنے والے کواڑ کی طرف اٹھ گئی جو زیادہ تر بند رہتا تھا۔ لیکن اس وقت کھلا ہوا تھا۔ بڑی باڑی وہیں تھی۔ دادی اماں کو پیڑ پودوں کا بہت شوق تھا اور ہم جب چھوٹے تھے تو دادی اماں نے ہم پوتے پوتیوں کے ساتھ مل کر اس میں طرح طرح کے پیڑ اگائے تھے۔ وہ سارے پیڑ بھی اب جوان ہو چکے تھے اور ان میں پھل پھول آ رہے تھے۔ آم کی کیریاں شاخوں پر جھولا جھول رہی تھیں۔

آم، جامن، لیموں، شریفہ، امرود اور چیکو کے جھنڈ کے بیچ مجھے ایک ننھا سا وجود دکھائی دیا۔

معصوم آنکھوں اور گول مٹول چہرے والا ایک وجود میرے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات مچل رہے تھے شاید اسے کوئی خوب صورت پرندہ کسی شاخ پر بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ایک انگلی اٹھائی اور ہونٹوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایسے جیسے ایک اجنبی نہ ہو کر میں اس کے بچپن کا دوست ہوں۔

میں نے بھی اشارے سے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا......

لیکن آتے آتے بھی وہ پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ تمام فکروں سے بے نیاز، اسے اس سے کوئی مطلب نہ تھا کہ آنگن میں اس کے متعلق کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

اس کی شرٹ جو کبھی سفید رہی ہوگی اب مٹ میلی ہو رہی تھی۔ آستین کا کف پھٹا ہوا تھا اور سامنے کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے۔

پرانی بلو رنگ کی ہاف پینٹ، گھسی ہوئی ہوائی چپل دونوں پیروں میں الگ رنگ کے فیتے۔ جو کسی دوسری ٹوٹی چپل سے نکال کر لگائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''ابول......''

'ابول کیا؟ پورا نام بتاؤ بچے۔'' میں نے کہا۔

"ابوالکلام احمد۔اس نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"ابوالکلام آزاد تو نہیں۔میں نے مذاق کیا۔

"وہ تو بہت بڑے آدمی تھے بھیا۔" وہ شرماسا گیا۔

اپنے دیش کے لیے بھی انھوں نے بڑے بڑے کام کیے۔ پھول پودوں کا بھی بہت شوق تھا انھیں۔ایک چڑیا سے ان کی دوستی بھی ہوگئی تھی جب وہ احمد نگر جیل میں تھے۔ ہندوستان میں پائے جانے والے ہر طرح کے پھولوں اور پرندوں کے متعلق انھیں بہت جانکاری تھی۔"

میں حیران ہکا بکا اس بچے کا منھ تاک رہا تھا۔"تمھیں اتنی ساری جانکاری ہے،ان کے بارے میں؟۔

"جب اسکول میں پڑھتا تھا تب ماسٹر جی نے بتایا تھا۔" تم اسکول میں پڑھتے تھے تو پڑھائی کیوں چھوڑ دی۔"

"میرے ابا گزر گئے نا۔" وہ ایک دم سے اداس ہوگیا۔

"وہ کون ہیں جو تمھارے ساتھ آئے ہیں۔؟"

"چچا ہیں۔میرے ابا ڈمپر چلاتے تھے ایک ایکسیڈینٹ میں ان کی موت ہوگئی۔ان کی جگہ اماں کو نوکری مل جاتی۔لیکن چچا نے نہیں کرنے دی۔بولے۔"ہمارے گھر کی عورت باہر نکل کر کام نہیں کرے گی۔"

"اماں کو منا کر انھوں نے کاغذ پر اپنے لیے دستخط کرالیے۔"

"تو کیا چچا تمھاری اور تمھاری اماں کی دیکھ بھال نہیں کرتے؟"

"کہتے ہیں۔" پیسے کم ملتے ہیں۔اتنے میں سب کا گزارا نہیں ہو سکتا۔" جبکہ ابا نوکری کرتے تھے تو چچا چچی اور ان کے تمام بال بچوں کو وہی کھلاتے تھے۔ہمارا کھانا ایک ساتھ پکتا تھا۔ پتہ نہیں چچا کو کم پیسے کیوں ملتے ہیں؟اب تو ہمارا کھانا بھی الگ پکتا ہے۔میری پڑھائی بھی چھوٹ گئی ہے کہتے ہیں" کھانا تو پورا نہیں ہوتا۔ پڑھائی کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔"

میرے دماغ کی نسیں پھڑکنے لگی ہیں۔غصے سے کلیجہ کھول رہا ہے میرا دل کرتا ہے آنگن میں بیٹھے اس شخص کے سر پر جوتوں کی برسات کر ڈالوں۔

بڑی مشکل سے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اس کی انگلی پکڑ کر آنگن میں لے آتا ہوں۔ابول کی پھٹی پینٹ کی پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کرکے پوچھتا ہوں تاکہ ماحول بدل جائے۔

"اس میں کیا ہے؟ کوئی چڑیا تو نہیں پکڑلی۔"

"نہیں بھیا اس میں کچی کیریاں ہیں۔میں نے اپنے ہاتھوں سے توڑی ہیں۔آپ بھی کھاؤ نا۔اپنے ہاتھ سے توڑی ہوئی کیری کھلانے کی خوشی اس کے معصوم چہرے پر اتر آئی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے ایک کیری لے لی اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔اس وقت مجھے لگا کہ میرا بچپن ایک بار پھر لوٹ آیا ہے۔

اس دن سے ابول ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ میں جب تک رہا اس کے ساتھ کبھی لوڈو، کبھی کیرم کبھی فٹ بال کھیلا کرتا۔

کچھ دن بعد ہمارا سیکنڈ ایئر کا ایگزام شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے چھٹیاں ختم ہوتے ہی میں علی گڑھ، لوٹ آیا اور سب کچھ بھول کر جی جان سے امتحان کی تیاری میں جٹ گیا۔

کچھ دن بعد اماں کا خط ملا کہ چھوٹے چچا کا ٹرانسفر ہمارے ہی شہر میں ہوگیا ہے، اب وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔گھر میں اتنی ساری جگہ ہے تو تمھارے ابا نے انھیں کرائے کے مکان میں رہنے سے منع کیا ہے۔"

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی۔کیونکہ چھوٹے چچا کے ماشاءاللہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں بھی تھیں۔اب اماں ابا کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔سب مل کر سنبھال لیں گے، وہیں کے کسی اسکول میں ان کا داخلہ بھی ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر میں نے خوب دل لگا کر امتحان دیا۔کچھ دنوں بعد ریزلٹ بھی آ گیا۔اسٹوڈینٹ آف دا ایئر اور فرسٹ کلاس فرسٹ کی ڈگری کے ساتھ میرے ساتھیوں نے میرا فوٹو کھینچ کر اماں کو بھیج دیا۔

جواب میں اماں کا دعاؤں بھرا خط ملا۔ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹے چچا کے لڑکوں کا دل پڑھائی میں ذرا بھی نہیں لگتا۔سارا دن آوارہ گردی کرتے ہیں۔ساؤنڈ بکس پوری آواز کے ساتھ کھلا رہتا ہے۔بیہودہ قسم کے گانے بجتے ہیں۔جس کی دھن پر یہ لوگ ناچتے رہتے ہیں۔چیخنا چلانا شور مچانا اور بے چارے ابول کو دوڑاتے رہنا۔اپنے جوتے تک وہ لوگ خود سے پالش نہیں کرتے۔

اماں کے خط سے ایک اور افسوس ناک خبر ملی!ابول کے چچا چچی نے اس کی ماں کو بھی گھر سے نکال دیا۔اب وہ بے چاری ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی ہے۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد اسے مٹی ڈھونے کی نوکری ملی لیکن ٹھیکیدار اول تو پورے پیسے بھی نہیں دیتے اوپر سے شراب پی کر بھدے مذاق بھی کرتے ہیں وہ یہ سب سہہ نہیں سکتی تھی اس لیے چھوڑنی پڑی۔یہ سب ابول کے اس شیطان چچا کی وجہ سے ہوا تھا۔

میرا خون کھول اٹھا، مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔کھولتے دل و دماغ کو سکون دینے کے لیے کمرے سے نکل کر یونیورسٹی کے باغیچے میں چلا آیا۔

کچھ بن جانے میں ابھی تقریباً دو سال اور لگیں گے کروں تو کیا کروں۔سوچتے رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔اس لیے کتاب اٹھا کر

ورق گردانی کرنے لگا۔ اس دفعہ میں نے سوچا تھا کہ گھر نہ جا کر یہیں رک کر پڑھائی کروں گا، کرائے میں جو پیسے لگتے ہیں بچ جائیں گے۔

لیکن بہت چاہ کر بھی اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا اور چھٹیوں کی خبر ملتے ہی کپڑے سمیٹے اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا اور بنا ریزرویشن ہی ٹرین میں بیٹھ گیا۔

گھر پہنچتے ہی مجھے اپنا گھر ڈھونڈھنا پڑا۔ کیونکہ آٹھ ماہ پہلے جو گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ پرسکون، صاف ستھرا، لپا پتا۔

گھر میں ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا سوائے اماں کے۔

ہر طرف چیخ چلانے کا شور اور ہنگامے کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔

ان تمام ہنگاموں کی چکی میں ایک معصوم بچپن پس رہا تھا۔

''ابولا۔ جلدی سے بالٹی میں نہانے کا پانی بھر کر غسل خانے میں پہنچادے۔'' چچی نے آواز لگائی۔

''ابولا۔ میرے جوتے پالش نہیں کیے رے......''

''ذرا بھی پھرتی نہیں کھا کھا کر چربی چڑھ گئی ہے سالے کو'' چچا کے دونوں بیٹے ایک ساتھ چلا رہے تھے۔

''ابولا ابولا جلدی سے ناشتہ لے کر آ'' چچا پکارے۔

''ابھی تک دودھ لانے بھی نہیں گیا۔ چھوکرا...... گوالا دودھ میں پانی ملادے گا حرام کے پیسے آتے ہیں کیا۔'' چچی چلاتی ہیں۔

ابوالکلام سے ابول، ابول سے ابولا بنا معصوم بچپن ایک بار نظر اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے اور سلام کر کے چچی کی پکار پر دوڑ جاتا ہے۔

اس بار ابوالکلام کی جیب خالی ہے۔ جبکہ آموں کا موسم شباب پر ہے۔

اماں ایک ہاتھ میں دودھ روٹی کا کٹورا پکڑے دوسرے ہاتھ کو زمین پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کر رہی ہیں اور ان کی نگاہیں ابول کو تاک رہی ہیں۔

دالان کی چوکی پر اپنا شولڈر بیگ، پھینک کر اماں کو سہارا دیتا ہوں۔ میری کنپٹیاں چٹخنے لگتی ہیں۔ ماتھا جل رہا ہے۔ میرے منھ سے کوئی آواز نہیں نکل پاتی۔

ٹھیک اسی وقت ابوالکلام کی ماں روتی ہوئی آنگن میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی پرانی ساڑی کا آنچل پھٹا ہوا ہے۔

''بی بی جی۔ دیکھئے دیکھئے آج اس شیطان نے میرا کیا حال کر دیا ہے، پورے چھ مہینے تک آدھا پیٹ کھا کر چھ ہزار روپے جوڑے تھے۔ اڑوس پڑوس میں کوٹنا پیسنا، برتن بھانڈا کر کے گٹیاں پھوڑ کے ان پیسوں سے سوچا تھا کہ ایک پھوس کی جھونپڑی ڈال لوں گی۔ پہلے میری نوکری دھوکہ دے کر ہڑپ لی۔ ہمیں گھر سے بے گھر کیا۔ بچے کی پڑھائی چھڑا دی اور آج اس نے اتنی محنت سے جوڑی گئی پونجی بھی چھین لی۔ روپے چھیننے کے لیے آنچل کھینچا تو آنچل بھی پھٹ گیا۔ کہتے کہتے اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ گئی۔ آگے کچھ نہ بول سکی اور شکست خوردہ قدموں سے باہر جانے لگی۔

اماں کے ہاتھ میں دودھ روٹی کا کٹورا کانپ رہا تھا۔ اماں کے ہاتھ سے کٹورا لے کے میں ابا کو دے آیا۔

ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد صبح سویرے اٹھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ آج میں نے ایک اہم فیصلہ لے لیا ہے۔

بنا کسی تمہید کے اماں سے بولا۔

''اماں...... آپ ابوالکلام کی ماں کو اپنے ساتھ رکھ لیجیے۔''

''مگر بیٹا پنشن کی اتنی قلیل رقم میں اتنے لوگوں کا......؟''

''ابوالکلام کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں یونیورسٹی کے اسکول میں اس کا داخلہ کرادوں گا۔ تا کہ اس کا کھویا ہوا بچپن اسے واپس مل سکے۔''

''اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ پڑھائی کے ساتھ پارٹ ٹائم جاب کر سکتا ہوں۔ ٹیوشن پڑھا سکتا ہوں۔ شہروں میں ٹیوشن کے لیے اچھے خاصے پیسے مل جاتے ہیں۔''

''اب اپنا خرچ اٹھانے کے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کے لیے بھی کچھ پیسے بھجوا سکتا ہوں۔''

گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ تماشہ اب مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔''

''آم کے باغ اپنے ابوالکلام کو ڈھونڈھ رہے ہیں اماں......''

اگلے موسم میں پھر اس کی جیب کچی کیریوں سے بھری ہوگی۔

اور......

اپنے ہاتھ سے کیریاں توڑ کر کھانے کی خوشی اس کے چہرے پر رقص کر رہی ہوگی!!

□□□

Mrs. Shireen Niyazi
Teachers Colony
River Side
Bhurkunda-829135 (Jharkhand)

پرت

پروفیسر مہ جبین نجم غزال

اپنے مخصوص یونیفارم میں ملبوس، ٹرین کے بیرے نے میری سیٹ کے آگے کا اسٹینڈ کھول کر چائے اور ناشتے کی ٹرے رکھ دی تو میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا اکیلا ہوں۔ مجھے شمالی ہند کی ایک لسانی کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔

سلیپر کوچ کا ریز رویشن نہیں مل سکا تو مجبوراً چیر کار میں سفر کرنا پڑا۔ یعنی پورے پینتیس گھنٹے مجھے بیٹھے ہی رہنا تھا۔ مسلسل بیٹھے بیٹھے جسم میں درد ہونے لگا تھا۔ مگر مجھے درد کے احساس سے زیادہ اس بات کا خیال ستا رہا تھا کہ میں بہت تنہا ہو گیا ہوں!

میں نے بسکٹ، نمکین اور مٹھائی کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ اکتاہٹ سے اپنے بیگ میں رکھ دیے۔ پتہ نہیں یہ حقیقت تھی یا میرے احساس کی کڑواہٹ کا گمان کہ میں نے سوچا ٹکٹ سمیت کھلانے پلانے کے روپے اینٹھنے کے بعد ہم مسافروں کو ضرورت سے زیادہ ہی کھلایا پلایا جا رہا ہے۔ کسی محنت کے بغیر پہروں کرسی سے چپٹا ہوا انسان معمول کے کھانے کے ساتھ دودھ، مکھن، کریم والے بسکٹ، چاکلیٹ، مٹھائی، آئس کریم اور ٹھنڈے میٹھے مشروب لیتا رہے گا تو دو ہی دن میں اس کے وزن میں اضافہ ہو جائے گا۔ شاید اسی لیے میرے پاس والی چیئر پر بیٹھی ہوئی خوبصورت عورت جس نے رات کے کھانے کے لیے ویج فوڈ کا آرڈر دیا تھا، اب صرف سلاد کی فرمائش کر رہی تھی۔

دوپہر تین بجے کے قریب جب ناگپور شہر کا اسٹیشن آیا تھا اور ٹرین پندرہ بیس منٹ تک رکی رہی تھی تو خواہش کے باوجود میں ٹرین سے اتر کر ٹہلا نہیں بلکہ دروازے میں کھڑا خالی خالی نظروں سے اسٹیشن کو دیکھتا رہا۔ دل ویران ہو تو خواہشیں بھی شاید ٹھنڈی پڑنے لگتی ہیں۔ اب شام کے ڈھلنے کے ساتھ اے سی کی ٹھنڈی ہوا سے جسم میں کپکپاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ سگریٹ پینے کی خواہش کو ترک کرتے ہوئے میں نے چینی اور دودھ کے پاؤڈر کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ کھول کر کپ میں چینی اور دودھ کا پاؤڈر ڈالا۔ اب بیرا گرم پانی سے بھرا فلاسک بھی تمام مسافروں کی ٹرے میں رکھ گیا تھا۔ میں نے چائے بنائی اور گرم گرم چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میری نظر پاس بیٹھے ہوئے تین مسافروں پر پڑی جن میں سے ایک نیا شادی شدہ جوڑا تھا اور دوسری خود میں کھوئی کھوئی سی ایک عورت۔ دولہا اپنی کمسن دلہن کی بجائے اس بڑی عمر کی پرکشش عورت کو انکھیوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ عورت اس سے بے خبر کوئی رسالہ پڑھے جا رہی تھی۔ میری نظریں دولہے کی نظروں سے ٹکرا گئیں تو میں بے اختیار مسکرا دیا۔ دولہا سٹپٹایا اور اپنی دلہن سے کچھ کہنے لگا، غالباً وہ اپنے لیے چائے بنانے کی فرمائش کر رہا تھا کیونکہ اس کی دلہن نے فوراً چائے بنا کر پیالہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ میں نے معنی خیز نگاہوں سے دولہے کو دیکھا گویا کہنا چاہ رہا ہو کہ گھبراؤ مت، اس میں تمھاری کیا غلطی، ہلکے میک اپ اور پیازی ساڑھی والی وہ عورت ہے ہی غضب کی چیز! کچھ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ عمر رفتہ ان کے چہرہ کے نقوش کو بگاڑنے کی بجائے مزید نکھار دیتی ہے اور وہ ہر عمر میں جاذب نظر لگتے ہیں!

مگر میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں؟ میں تو بہت اکیلا پڑ گیا

ہوں۔ ٹرین کا بیرا صبح جب اس چیئر کار کے تمام مسافروں کو انگریزی اخبار کی ایک ایک کاپی دے گیا تھا اور تقریباً سارے مسافر ایک ہی اخبار پڑھنے میں منہمک ہو گئے تھے، یا پھر جب تمام مسافر ایک ہی سا بریک فاسٹ، لنچ، اسنیکس اور ڈنر لیتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے مجھے لگتا ہے جیسے ہم سب ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ ایک بڑا سا خاندان اس آرام دہ ٹرین کار میں سفر کر رہا ہو۔ ورنہ دوسرے اوقات میں میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتا ہوں۔

"نازو چمپئی رنگت، بڑی بڑی آنکھوں، ستواں ناک اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہونٹوں، دراز قد اور سڈول جسم کی مالک منکسر المزاج لڑکی تھی۔ اس کا سراپا پرکشش اور اس کی آنکھیں نہایت جادو بھری تھیں۔ اس پر اس کی سادگی، معصومیت اور جذبہ ایثار کے ساتھ حسن سلوک نے مجھے اس کا غلام اور پھر دیوانہ بنادیا۔"

وہ خوبصورت اور پرکشش عورت بھلے ہی غضب کی چیز ہو، میری نازو سے زیادہ غضب کی چیز ہرگز نہیں۔ نازو تو میری بائک پر جس راستہ سے گزرتی اس راستہ کی کاروں کی رفتار دھیمی ہو جاتی۔ موٹر بائکس آگے بڑھنے کی بجائے اپنے منچلوں سمیت لوٹ آتیں اور حسرت سے اس کا تعاقب کرتیں۔ نازو سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہتی۔ اس میں غضب کا ضبط اور وقار ہے۔ ایسے لمحوں میں وہ اور زیادہ معصوم لگتی۔ صنف مخالف ہی نہیں، عورتیں اور بچے تک اس کے حسن ظاہر سے متاثر ہو جاتے۔ پھر میں تو اس کے حسن باطن سے بھی واقف تھا، کیسے نہ اس کا دیوانہ ہوتا۔ اس کا حسن لاجواب تھا تو میرا پیار بھی شاید بے مثال تھا۔ جب جب وہ اپنی چند کمزوریوں اور غلطیوں پر نادم ہوتی اس کے لیے میرا پیار اور بڑھ جاتا، بلکہ اس کا یوں نادم ہونا مجھ سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ میں نے اس سے سینکڑوں بار کہا تھا کہ وہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہو سکتی۔ خدا نے اسے کچھ الگ ہی مٹی سے بنایا ہے۔ اسی لیے حسن سلوک سے بھری اس کی شخصیت کچھ اور ہی جادو جگاتی ہے اور کچھ لوگ اس پر بری طرح فدا ہو جاتے ہیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اپنی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہمدردی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اپنے انداز میں چند احباب کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتی ہے تو کیا غلط کرتی ہے۔ کیوں نادم ہوتی ہے۔ یہ بھی اس کی خوبی ہے جو بھلائی کر کے شرمندہ ہوتی ہے۔ شاید اسے میرے احساسات کے مجروح ہونے کا خیال آجاتا ہے۔ مگر میں خود بھی کچھ الگ ہی مٹی سے بنا ہوں۔ میں نے اسے اتنی چھوٹ دے رکھی ہے کہ اگر وہ سچ مچ کسی اور کو بھی پسند کرنے لگ جائے تو بھی مجھے گوارا ہے۔ میں اسے کسی بندش میں جکڑنا نہیں چاہتا کہ فلاں ہیرو تمہیں کیوں اس قدر پسند ہے کہ اس کی تصویریں اکٹھی کرتے اور تعریفیں کرتے نہیں تھکتی ہو (یہ اور بات کہ اس نے کبھی ایسا کچھ کیا ہی نہیں)۔ اسے بالکل آزاد فضاؤں میں اوپر بہت اوپر اڑتے دیکھ کر ہی مجھے خوشی ہوتی ہے۔

نازو چمپئی رنگت، بڑی بڑی آنکھوں، ستواں ناک اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہونٹوں، دراز قد اور سڈول جسم کی مالک منکسر المزاج لڑکی تھی۔ اس کا سراپا پرکشش اور اس کی آنکھیں نہایت جادو بھری تھیں۔ اس پر اس کی سادگی، معصومیت اور جذبہ ایثار کے ساتھ حسن سلوک نے مجھے اس کا غلام اور پھر دیوانہ بنادیا۔

میں نے اس کے ساتھ بہ حیثیت رفیق حیات پورے دس سال گزارے ہیں یعنی پوری ایک دہائی۔۔۔ اور اس دوران ایک پل کے لیے بھی ایک دوسرے کے لیے ہمارے پیار میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ ہر لمحہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ میرے لیے یہ احساس کچھ کم قابل فخر نہ تھا کہ اس نے میرے پیار کا جواب پیار سے دیا اور مجھے ایک ایسی وادی میں لے گئی جہاں محبت کے ہزارہا خوبصورت پھول مہک رہے تھے۔ بلکہ وہ میرے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو ہر لمحہ تیار رہتی۔ میں نے اپنے اور اس کے درمیان بچوں کی دیوار اٹھانی نہیں چاہی تو وہ اس کے لیے بھی بخوشی تیار ہو گئی۔ مگر پھر اس نے مجھے سمجھایا کہ بچے میاں بیوی کے درمیان کی دیوار نہیں بلکہ پل ہوتے ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ نازو کی خوبصورت دنیا میں اس پل کی تعمیر نہ کر کے میں اس کی دنیا کو ادھوری اور اس کی خوشی کو نامکمل رکھ رہا ہوں۔ میں نے ایک بچے کے لیے حامی بھر لی۔ اس دن وہ گویا سچ مچ فضاؤں میں اڑنے لگی۔ اس نے یہ لالچ بھی دیا تھا کہ جب ہم عمر رسیدہ اور کمزور ہونے لگیں گے تو ہماری اولاد ہمارے ہاتھ کی کم از کم ایسی لاٹھی تو ہوگی جس کے سہارے کوئی اندھا بھی اپنی منزل تلاش کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری محبتوں اور شفقتوں کا کوئی محور بھی تو ہونا چاہیے۔

اس مرحلہ سے گزر کر جب ہم نے فیملی پلاننگ کرنی چاہی تو جھٹکا لگا کہ مسلسل حمل کو ٹالنے کی گولیاں کھانے کے سبب اب سچ مچ حمل ٹک نہیں پا رہا۔ تب ہم نے دعا کی آرزو میں خانقاہوں اور درگاہوں کے چکر

کاٹے۔ آخر اس نے میرے جونیئر کو جنم دیا تو درحقیقت میرے دل میں خوف جاگا کہ کہیں اب وہ مجھے بھول کر صرف اس کی نہ ہوجائے۔ مجھے یہ بات تو گوارا ہے کہ وہ میرے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی چاہے، مگر مجھے بھول جائے اور صرف کسی اور کی ہوجائے اس بات کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نازو اب ایک باشعور عورت بھی ہے۔ اس نے مجھے اور علی کو چاہنے میں توازن کا برابر خیال رکھا۔ ماتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی پلڑا ادھر جھک بھی جاتا تو جلد ہی سنبھل بھی جاتی اور میں مسکرا دیتا۔ آخر اس نے مجھ سے پیار کیا ہے۔

مگر آج ہنستے ہنستے اس کے اس انکشاف پر کہ اسے مجھ سے کبھی پیار نہیں ہوا تھا بلکہ میری اس دھمکی سے گھبرا کر کہ اس نے مجھ سے شادی نہیں کی تو میں مر جاؤں گا، اس کی ہمدردی بھرے جذبات کے سمندر میں طوفان سا اٹھا اور اس نے حامی بھر لی تھی۔ پھر پورے دس سال برابر پیار سے میرا خیال رکھتی رہی اور ہمیشہ رکھے گی۔۔۔، میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ میں اس کے رفیق حیات کے قابل فخر منصب سے گر کر ایک بھکاری بن گیا ہوں جس کو وہ دس سال سے بڑے پیار سے خیرات دیتی رہی ہے اور ہمیشہ دیتے رہنے کا وعدہ بھی کر رہی ہے۔ میں اس لمحہ سے خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے میں اچانک بے گھر ہو گیا ہوں۔ کاش وہ یہی کہہ دیتی کہ پہلے تو اسے پیار نہیں تھا پھر شادی کے بعد رفتہ رفتہ اسے مجھ سے پیار ہو گیا۔ دکھی دل کے ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ کیا کوئی مسلسل دس سال کے طویل عرصہ تک اداکاری کر سکتا ہے؟ میری نازو نے کی ہے۔ اس نے کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ اسے مجھ سے پیار نہیں۔ میں اس کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

مجھے اپنے اکیلے پڑ جانے کا جتنی شدت سے احساس ہو رہا ہے، راجدھانی ایکسپریس کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر سچ مچ۔۔۔ "ہنوز دلی دور است"۔ میں اداسی سے اپنے آپ مسکراتا ہوں اور کانوں میں ایئر فون لگا کر آئی پیڈ پر جگجیت سنگھ کی آواز میں غزلیں سننے لگتا ہوں۔ مگر جگجیت سنگھ کی آواز کے سوز سے گھبرا کر ایئر فون کانوں سے نکال دیتا ہوں اور بٹن کی مدد سے اپنی سیٹ کو ایزی چیئر کی شکل میں لا کر اس کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ ذہن کے پردے پر ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی نازو کا چہرہ ابھر آتا ہے۔ "پاگل" - یہ کس نے کہا؟ نازو نے مجھ سے کہا یا میں نے نازو سے؟ مجھے کوئی جواب تو نہیں ملتا مگر پتہ نہیں کیوں ایک سکون سا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے طوفان کے تھمنے کے بعد کی کیفیت ہو۔

> "راجدھانی ایکسپریس اب آہستہ آہستہ ڈول رہی ہے۔ اچانک میرے دل میں ایک سوال اٹھتا ہے اور میں تھرا جاتا ہوں کہ پورے دس سال نازو کتنی اکیلی رہی ہو گی۔ اس نے اس دوران میرے ہر فیصلے پر خوشی سے اثبات میں سر ہلایا ہے میری ہر مرضی کو دل سے قبول کیا ہے۔ ہر معاملہ میں میری پسند کے آگے مسکرا کر یوں سر تسلیم خم کر دیا ہے جیسے اس کے روشن ماتھے پر ذرا سا بھی بل آئے گا تو میں کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔۔۔ کیا یہ اس کی محبت نہیں ہے؟"

راجدھانی ایکسپریس اب آہستہ آہستہ ڈول رہی ہے۔ اچانک میرے دل میں ایک سوال اٹھتا ہے اور میں تھرا جاتا ہوں کہ پورے دس سال نازو کتنی اکیلی رہی ہوگی۔ اس نے اس دوران میرے ہر فیصلے پر خوشی سے اثبات میں سر ہلایا ہے میری ہر مرضی کو دل سے قبول کیا ہے۔ ہر معاملہ میں میری پسند کے آگے مسکرا کر یوں سر تسلیم خم کر دیا ہے جیسے اس کے روشن ماتھے پر ذرا سا بھی بل آئے گا تو میں کانچ کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔۔۔ کیا یہ اس کی محبت نہیں ہے؟

وہ تو آج ہنستے ہنستے اس کی زبان پر اس کا پرانا سچ آ گیا تھا جس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ مگر اب۔۔۔ احساس کی بس ایک پرت کے اترنے کے ساتھ ہی میں گویا پختہ دل و دماغ کا مالک ہوش مند انسان بن گیا ہوں اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ ٹرین دہلی کے بجائے واپس بنگلور کی طرف پلٹ کر تیزی سے دوڑنے لگے اور میں اپنے گھر جا کر پوری شدت سے نازو سے لپٹ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں، ہمیشہ کی طرح۔

نہیں، ہمیشہ سے کہیں زیادہ!

❑❑❑

Prof. Mah Jabeen Najm Ghazaal
"Prime Residency" (Near Post Office)
FF2A, First/Second Floor
Mangalore Road
Mysore-570018 (Karnataka)

ڈاکٹر عائشہ فرحین

غزل

محبت ہماری امانت تھی جس کی
اسی کو ہے ہم سے عداوت زیادہ

ہے مشکل جہاں میں صداقت پہ چلنا
کہ لگتی ہے اس میں ریاضت زیادہ

جہاں میں ہیں اسکی لیاقت کے چرچے
زباں میں ہے جسکی حلاوت زیادہ

یہ دور سیاست میں ،ایک ہو کہ چلنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

ملے جو کسی کو رعایت کسی کی
وہ کرتا ہے خود ہی بغاوت زیادہ

عداوت کے پھیرے ہوں گر ذہن و دل پر
ہلاکت سے ہے یہ ہلاکت زیادہ

محبت کے قصے ہیں ہر سو زباں پر
ہے الفت بہت کم خباثت زیادہ

دلوں میں ہیں نفرت کے شعلے بھڑکتے
زباں پر ہے لیکن محبت زیادہ

فعولن فعولن میں اشعار ہیں یہ
اسی واسطے ہے فصاحت زیادہ

سنا ہے کہ فرحین اہل ادب میں
حقیقت ہے کم اور وکالت زیادہ

Dr. Aisha Farheen
Bi Bi Raza PU College
Khaja Colony
Gulbarga-585104 (Karnataka)

لذیذ پکوان

سبزی کے پکوڑے

اجزا: آلو (ابال کر میش کریں) 1 عدد، مٹر (ابال کر میش کر لیں) چوتھائی پیالی، کشمیری مرچ (بیج نکال کر آدھا آدھا کر لیں) 4 عدد، مرچ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، بیسن 1 پیالی، سوڈا چٹکی بھر، نمک اور تیل حسب ضرورت

ترکیب: بیسن، نمک، سوڈا، مرچ اور پانی ڈال کر پیسٹ بنا لیں۔ آلو، مٹر، نمک اور مرچ ملائیں۔ تھوڑا سا آمیزہ ہر کشمیری مرچ میں بھریں۔ پھر ان کو بیسن کے آمیزہ میں ڈبو کر گرم تیل میں سنہری تل لیں۔ پودینے کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

ویجی ٹیبل کریم سلاد

اجزا: کریم ایک کپ، چینی ایک کھانے کا چمچہ، کالی مرچ ایک چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب: ایک پیالے کے اندر ایک کپ کریم، ایک کھانے کا چمچہ چینی اور ایک چوتھائی چائے کا چمچہ کالی مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ اب اس میں ایک عدد اُبلا ہوا آلو، ایک عدد کھیرا، ایک عدد بند گوبھی، ایک عدد گاجر کو باریک کاٹ کر ڈالیں۔ ساتھ ہی ایک کپ سوئٹ کارن اور ایک کپ اناناس بھی ملا دیں۔ پھر اسے پلیٹ میں نکال کر سرو کریں۔

وانٹون

اجزا: چکن 250 گرام، نمک چوتھائی کپ، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، سرکہ ایک کھانے کا چمچ، سویا سوس ایک کھانے کا چمچ، چلی ساس ایک کھانے کا چمچ، سموسہ پٹی دس عدد، انڈا ایک عدد

ترکیب: چکن کو اُبال کر ہڈی الگ کر کے بلینڈر میں ریشہ کر لیں۔ چار کھانے کے چمچ تیل میں چکن، نمک، کالی مرچ، سویا چلی، سرکہ ڈال کر دو منٹ پکا کر اتار لیں۔ اب سموسے کی پٹی کے تین انچ کے چوکور پیس بنالیں۔ اس کے درمیان میں چکن رکھ کر دونوں سائیڈ کو انڈا لگا کر بند کر لیں اور جو شیپ دینا چاہیں وہ دے کر فرائی کر لیں۔

پالک کا سوپ

اجزا: پالک آدھا کلو، پیاز آدھا کپ، لہسن 3 عدد، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ ایک کھانے کا چمچہ، سفید مرچ ایک چائے کا چمچہ، مکس ہرب ایک چائے کا چمچہ، چکن کیوب 2 عدد

ترکیب: پین میں 4 کھانے کے چمچے تیل میں چوپ، پیاز، لہسن کو فرائی کریں۔ ساتھ ہی چکن کیوب، کالی مرچ، سفید مرچ، مکس ہرب ڈال کر مکس کیجیے۔ ایک لیٹر پانی ڈال کر پالک ڈال دیں۔ پالک گل جائے تو بلینڈر کر کے کریم مکس کریں اور پیش کریں۔

تندوری چکن پیزا

اجزا: ڈو بنانے کے اجزا: آٹا ڈھائی کپ، نمک آدھا چائے کا چمچ، چینی 1 چائے کا چمچ، خمیر ڈیڑھ چائے کا چمچ، انڈا 1 عدد، تیل 1 چوتھائی کپ، خشک دودھ 2 کھانے کے چمچ

فلنگ کے اجزا: پیزا ساس 4 کھانے کے چمچ، چکن بریسٹ 1 عدد، تندوری مصالحہ 1 کھانے کا چمچ، لیموں کا رس 2 کھانے کے چمچ، ادرک لہسن پیسٹ آدھا چائے کا چمچ، پیاز 1 عدد، شملہ مرچ آدھی، چیڈر چیز 1 کپ، موزریلا چیز 1 کپ، اوریگانو 1 چائے کا چمچ، زیتون کا تیل 2 کھانے کے چمچ

ترکیب: چکن کے لیے: چکن کو جولین کاٹ لیں۔ اور اسے تندوری مصالحے، ادرک لہسن اور لیموں کے رس سے میرینیٹ کریں۔ شملہ مرچ اور پیاز جولین کاٹ لیں۔ پین میں زیتون کا تیل گرم کر کے چکن کو فرائی کریں کہ گل جائے۔ پھر چکن کو کوئلے کا دھواں دیں۔

پیزا ڈو کے لیے: ایک پیالے میں میدہ، نمک، چینی، خمیر، خشک دودھ، انڈا اور تیل کو نیم گرم پانی سے نرم ڈو گوندھیں اور پھولنے کے لیے گریس کیے ہوئے ایک پیالے میں ایک گھنٹہ کے لیے چھوڑ دیں۔

اس کی نو انچ گول روٹی بیل لیں اور اسے آٹھ انچ کے چکنا کیے ہوئے سانچے میں رکھ دیں۔

چھری کی مدد سے روٹی پر نشان لگائیں اور اوون میں آٹھ منٹ کے لیے بیک کریں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

کرونا وائرس اور خواتینِ خانہ

ڈاکٹر اشرف آثاری

ہمارے معاشرے میں خواتینِ خانہ کا گھر گرہستی میں ایک اہم اور ذمہ دارانہ رول ہے جسے کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ وہ مستقبل کے معماروں کی جسمانی اور ذہنی پرورش ہو، ان کی نفسیاتی نشونما، صفائی وستھرائی، تعلیم وتربیت یا پھر اس طرح کے دیگر لاتعداد معاملات ہوں۔ آج کل کے دور میں اگرچہ عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں اور باہمی برابری، مساوات اور ایک دوسرے کے بھرپور تعاون سے ترقی کررہے ہیں اور انھیں ملکی آئین وقانون کی رو سے یکساں حقوق حاصل ہیں اور جنس کے اعتبار سے ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز اور فرق روا نہیں رکھا جارہا ہے وہاں انھیں حکومتی اور پرائیویٹ اداروں میں بھی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع اور رسہولیات بھی میسر ہیں اور ان کے لیے راہیں بھی ہموار رکھی گئی ہیں تاکہ ان کی بھرپور حوصلہ افزائی ہو۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ آج خواتین زندگی اور معاشرے سے متعلق ان شعبوں میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ بڑے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ کام کررہی ہیں۔ جہاں ان کی موجودگی کا تصور تک ناممکن تھا۔ اس سب کے باوجود بھی ہندوستانی معاشرے میں خواتین، اپنے اس منصب کو نہیں بھولیں ہیں جو انھیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے، یعنی آج بھی گھر گرہستی میں وہ اسی طرح جٹی ہوئی ہیں جس طرح وہ پہلے تھیں۔ افراد خانہ کو کھلانا، پلانا، صفائی ستھرائی، مہمانوں کی خاطر و مدارت، بزرگوں اور نونہالوں کی دیکھ بال، خونی رشتوں کی پاسداری اور احترام وغیرہ جیسی سب خوبیوں سے، خواتینِ خانہ، آج کے اس جدید اور نفسانفسی کے دور میں بھی متوصف ہیں اور اپنے فرائض منصبی کو احسن طریقے سے انجام دے رہی ہیں۔ گھر کے کسی فرد کی پریشانی میں، سب سے پہلے یہی آگے آجاتی ہیں اور اگر صحت سے متعلق کوئی معاملہ ہو، خاص طور پر بچوں کا، تو پھر ساری ذمہ داری جیسے ان ہی کے کاندھوں پر آجاتی ہے اور یہ اسے تدبر اور حوصلے کے ساتھ اچھی طرح سے نبھاتی بھی ہیں، خدانا خواستہ اگر وہ کسی وبائی بیماری کا معاملہ ہو تو پھر ان کی پریشانی دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

کرونا وائرس اس وقت تک دنیا کے تقریباً سو سے زیادہ ممالک میں پھیل چکا ہے اور اس سے لاتعداد لوگ، ان ممالک میں متاثر ہو چکے ہیں اور ہزاروں اب تک لقمۂ اجل بھی بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

کرونا وائرس ک SARS-CoV-2, COVID-19 کہا جاتا ہے ڈبلیو ایچ او (WHO) کے چیف نے ایک حالیہ بیان میں کہا ہے کہ اس وائرس کا ایسا نام تلاش کیا جانا چاہیے جو کسی جغرافیائی مقام، کسی جانور، کسی شخص یا پھر کسی گروہ سے منسلک نہ ہو۔ اس کا تلفظ آسان ہو اور اسی بیماری سے متعلق بھی ہو، انھوں نے یہ بھی کہا کہ نام کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اسے دوسری بیماریوں سے الگ کیا جاسکے۔

کرونا وائرس کے متعلق چند خاص خاص باتوں کا جاننا بہت

ضروری ہے۔

وجہ تسمیہ:۔ کرونا وائرس (Coronavirus) کا Corona دراصل لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تاج یا ہالہ کے ہوتے ہیں چونکہ اس وائرس کی شکل سورج کے ہالے یعنی کورونا کے مشابہ ہوتی ہے اسی مماثلت کی وجہ سے اس کا نام بھی کورونا وائرس رکھا گیا ہے۔

تاریخ:۔ سب سے پہلے اس وائرس کو 1960 میں دریافت کیا گیا۔ جو سردی زکام اور نزلہ و کھانسی سے متاثر کچھ مریضوں میں خنزیر سے متعدی ہو کر داخل ہوا تھا اس وقت اس وائرس کو ہیومن (انسانی) کرونا وائرس E229 اور OC43 کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس وائرس کی دوسری قسمیں بھی دریافت ہوئیں۔

اثرات:۔ کرونا وائرس بنیادی طور پر دودھ پلانے والے جانوروں اور پرندوں کے نظامِ تنفس اور انسانوں کے نظامِ انہظام کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس وائرس کے ذریعے انسانوں کو ہونے والی بیماریوں کی اس وقت چار قسمیں ہیں۔ سب سے زیادہ پائی جانے والی قسم انسانی کرونا سارس Cov ہے جو سارس سے بیماری کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ بالکل منفرد قسم کی بیماری ہے اس سے اوپری اور نچلے دونوں نظامِ تنفس یکساں متاثر ہوتے ہیں اور بسا اوقات آنت اور معدہ کا نمونیا بھی ہو جاتا ہے یہ مانا جاتا ہے کہ کرونا وائرس عام طور پر بالغ افراد کو سردی اور نزلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ لاحق ہو جاتا ہے۔

عام سردی میں ہونے والے نزلہ کی طرح، کرونا وائرس کے اثرات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیونکہ کرونا وائرس، عام سردی کے نزلہ کے برعکس ہوتا ہے لیبارٹری میں انسانی کرونا کی تحقیق بھی مشکل ہے۔

کرونا نمونیا وائرس۔ نمونیا یا تو براہِ راست یا ثانوی جرثومی نمونیا کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ مرغیوں میں متعدی برونکائٹس وائرس (IBV) نہ صرف نظامِ تنفس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بلکہ پیشاب کے راستہ کو بھی متاثر کرتا ہے اور اس کا امکان رہتا ہے کہ یہ وائرس مرغی کے تمام اعضا میں پھیل جائے۔ اسی طرح کرونا وائرس گھریلو جانوروں، پالتو جانوروں میں بھی بہت سی بیماریوں کا ذریعہ بنتا ہے جن میں کچھ خطرناک بھی ہوتی ہیں۔ کرونا وائرس عام طور پر گائے اور خنزیر دونوں، فارمی پالتو جانوروں کو ہوتا ہے اور ان دونوں میں اسہال (دست) کا سبب بنتا ہے۔

حفاظتی تدابیر:۔ کرونا وائرس کا ابھی تک کوئی خاص تصدیق شدہ علاج نہیں ہے۔ البتہ چند احتیاطی تدابیر ضروری بتائی جاتی ہیں، جو اسے دور رکھنے اور پھیلنے سے قابو میں رکھ سکے۔ جن میں مندرجہ ذیل تدابیر کی فوری ضرورت رہتی ہے اور ان پر بلا تاخیر عمل ہونا چاہیے۔ آغاز میں آپ

1۔ صابن یا Senetizer سے بار بار ہاتھ دھویا کریں۔

2۔ گندے ہاتھوں سے ناک، آنکھ اور منہ وغیرہ چھونے سے گریز کریں۔

3۔ متاثرہ افراد سے براہِ راست ہاتھ نہ ملائیں ان سے مناسب دوری رکھیں اور ان کی چیزیں استعمال میں نہ لائیں۔

4۔ جہاں یہ وبا پھیلی ہو وہاں نہیں جانا چاہیے اور نہ وہاں سے محفوظ علاقوں کی طرف بھاگنا ہی چاہیے اس طرح سے آپ اس وبا کو پھیلانے کا باعث بن سکتے ہو۔

کرونا وائرس کا پھیلاؤ:۔ کرونا وائرس چین سے شروع ہوتے ہی آناً فاناً ممالک کی سرحدیں سرعت کے ساتھ پھلانگتے ہوئے اب تک سو سے زیادہ ممالک میں پھیل چکا ہے ہزاروں لوگ اس سے لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور لاکھوں لوگ اس سے متاثر ہیں جو انتہائی طبی نگہداشت میں ہیں اور یہ عمل جاری ہے ہاں البتہ چین کی جس جگہ سے یہ وائرس دنیا میں پھیلا ہے وہاں اس کے کنٹرول ہو جانے کی رپورٹیں آ رہی ہیں۔ اس بات کے باوجود بھی، نئے نئے ممالک کی طرف اس کا پھیلاؤ ابھی تک جاری ہے۔ شعبہ طب سے متعلق ایک امریکی جریدے کی ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق اس وبا سے متاثر بیماروں کی آدھی تعداد 40 سے 59 برس کی عمر والے افراد پر مشتمل ہے صرف دس فیصد مریضوں کی تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کی عمر 39 سال سے کم ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق بچوں میں یہ تعداد بہت کم ہے ہاں البتہ پہلے ہی سے مختلف دوسرے امراض میں مبتلا مریضوں کے لیے یہ وائرس اور اس کی منتقلی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ماہرینِ طب کا خیال ہے کہ پہلے ہی ذیابیطس، امراضِ قلب، نظامِ تنفس اور اس طرح کے دیگر امراض میں مبتلا مریضوں کی قوتِ مدافعت، اس جان لیوا

وائرس کے آگے بے بس ہوسکتی ہے اوراس طرح کے مریض، دیگر مریضوں کے مقابلے میں کرونا وائرس سے زیادہ متاثر ہوسکتے ہیں، غالباً اسی لیے اس وائرس سے متاثر زیادہ لوگ نسبتاً بڑے عمر کے ہیں۔ ان مریضوں میں اس مرض کی ترقی سے نمونیا ہوجاتا ہے جس سے پھر موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ چین کے متاثرہ شہر ووہان کے ہسپتالوں میں داخل کرونا وائرس کے مریضوں پر تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ مذکورہ مریضوں میں زیادہ تعداد ان مریضوں کی ہے جو اس وائرس کے لگنے سے قبل کسی نہ کسی طبی مسئلے سے دوچار تھے۔ چین کے نیشنل ہیلتھ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس وائرس سے ہلاک ہونے والے مریضوں میں 80% مریضوں کی عمر 60 سال سے زیادہ تھی جبکہ 75% ایسے مریض تھے جو پہلے ہی سے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا تھے۔

ان سب حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کی اہمیت وافادیت سے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں اس طرح کے بحران سے پیدا شدہ خراب صورتِ حال میں خواتینِ خانہ پر، ہمارے معاشرے میں ان کے اسٹیٹس اور رتبے کو دیکھتے ہوئے بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے بچوں کے توسل سے تو ہے ہی کیونکہ خاتونِ خانہ یا ماں کو بچوں کی پہلی یونیورسٹی اور گھر کو پہلی دانش گاہ کہا جاتا ہے۔ لیکن گھر کے دیگر افرادِ خانہ، خاص طور پر بزرگوں، والدین وغیرہ کی ذمہ داری بھی اکثر گھروں میں خواتینِ خانہ ہی سنبھالتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہنگامی حالت میں کرونا وائرس کی پھیلتی ہوئی وبا کو حفاظتی تدابیر سے قابو میں کیا جاسکتا ہے کیونکہ ابھی تک اس کا کوئی تصدیق شدہ علاج دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ احتیاطی تدابیر میں خواتینِ خانہ کا بہت اہم رول ہے کہا یہ جارہا ہے کہ یہ وائرس مرغ مرغیوں کے تمام اعضا میں پھیل سکتا ہے اور گھریلو پالتو جانوروں کے گوشت اور دودھ وغیرہ کے ذریعے سے بھی انسانوں میں منتقل ہوسکتا ہے جو کہ کچن میں استعمال ہوتا ہے اور جس کا چارج خواتینِ خانہ کے پاس ہی ہوتا ہے۔ گندے ہاتھوں سے ناک، آنکھ اور منہ کو چھونے سے گریز بہت ضروری ہے اور بار بار ہاتھوں کو صابن یا Senetizer سے صاف کرنا چاہیے۔ متاثرہ افراد سے براہِ راست ہاتھ نہیں ملانا چاہیے۔ ان سے دوری رکھنا ضروری ہے۔ بھیڑ سے بچنا اور منہ کو مناسب طریقے سے ڈھانپنا ضروری ہے اور گھر کے جس فرد میں بھی بخار، کھانسی زکام، کمزوری، سانس پھولنے، سر درد جیسی علامات نمودار ہوں اس کا فوری علاج ہونا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں اس طرح کی اکثر ذمہ داریاں خواتینِ خانہ کے ہی ڈیپارٹمنٹ میں آتی ہیں اس لیے کرونا وائرس کے اس ہنگامی دور میں، مجموعی طور، ہم سب پر، اور انفرادی طور، خواتینِ خانہ پر کچھ زیادہ ہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ جنھیں ہم سب کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانا چاہیے تاکہ ہم دنیا میں اس دشمنِ انسان وائرس کو مزید کچھ بگاڑے بنا ہی شکست دے سکیں۔

Dr. Ashraf Asari
Sidrabal, Hazratbal
Srinagar-190006 (J&K)

حسن کی نگہداشت

گردن کے لیے بیوٹی ٹپس

خوبصورت لگنے کے لیے خوبصورتی کا احساس ضروری ہے۔ اگر آپ خود کو خوبصورت سمجھتے ہیں تو آپ خوبصورت دکھیں گے۔ خوبصورت دکھنے کے لیے آپ کا چہرہ، لباس اور بالوں کا انداز بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کے لباس کے ساتھ ساتھ آپ کے جوتے کا میچ کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ کے چہرے کے میک اپ کے ساتھ ساتھ آپ کی گردن کا میک اپ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ آپ اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنی گردن پر بھی فاؤنڈیشن لگایئے اور پھر انگلی کے پوروں کی مدد سے خوب اچھے سے پھیلا دیجیے۔ یاد رکھیے کہ آپ کو فاؤنڈیشن تھپتھپا کر لگانی ہے ملنی نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے چہرے پر صرف تھوڑی تک ہی میک اپ یا فاؤنڈیشن لگانا کافی سمجھتی ہیں تو یقیناً آپ کی گردن کا رنگ آپ کے چہرے کی رنگت سے ذرا گہرا محسوس ہوتا ہوگا اور دیکھنے والوں کو اچھا محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے تمام ماہر حسن گردن کے میک اپ اور بیس پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ تھوڑی کے نیچے سے شروع ہو کر آپ کی قمیض کے گلے تک کے سارے حصے کو خوبصورتی کے ساتھ میک اپ یا بیس لگا کر اپنی خوبصورتی میں اضافہ کیجیے۔

گردن کی خوبصورتی کے لیے آپ ایکسر سائز کیجیے۔ اپنی گردن کو دائیں سے بائیں گھمایئے اور سر کو آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آہستہ آہستہ آگے کی طرف جھکایئے۔ خیال رہے کہ گردن کی ایکسر سائز کے دوران آپ کسی بھی صورت میں اپنی گردن کو جھٹکے سے بچایئے۔ گردن اور کندھوں کے درمیان بہت سی نازک رگوں کا جال بچھا ہوتا ہے اور اگر جسم کے اس حصے سے پورے جسم کے نروس سسٹم کو بھی کنٹرول کیا جاتا ہے تو ہر ممکن احتیاط کیجیے کہ آپ کی کسی بھی ایکسر سائز یا یا کھیل کے دوران گردن کے مسلس ڈیمیج نہ ہونے پائیں۔ روزانہ ایکسر سائز کا معمول اپنا لیجیے کیونکہ یہ آپ کی گردن کے مسلس کو نہ صرف مضبوط کریں گی بلکہ آپ کی شیپ اور بھی خوبصورت ہو جائے گی۔

اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنی گردن کی جلد کا بھی خیال رکھیں۔ گرمیوں میں عموماً گردن کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ دھوپ میں باہر نکلنے سے پہلے اپنی گردن کے چاروں طرف اور چہرے اور باقی جسم کے حصوں کو کسی اچھی سی

سن بلوک کریم کی مدد سے بچائیں۔ سورج کی الٹرا وائلیٹ شعاعیں آپ کی جلد کو جلا دیتی ہیں اور آپ کی جلد کا رنگت سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ سن بلوک استعمال کرنے سے آپ نہ صرف ان خطرناک شعاعوں سے بچ پائیں گے بلکہ اپنی گردن، جلد اور باقی جسم کے حصوں کو بھی سیاہی مائل ہونے سے بچائیں گی۔ ذرا سی احتیاط آپ کو کئی قسم کی تکالیف سے نجات دے گی۔

اپنی گردن کی جلد کی صفائی پر خاص دھیان دیجیے۔ جب بھی آپ فیشیل کریں تو اپنی گردن کو قطعی نظر انداز نہ کیجیے۔ اپنی گردن کے پچھلے حصے کو بھی اسی طرح صاف رکھیے جس طرح آپ اپنے جسم کے دوسرے حصوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کرتی ہیں۔

ہاتھوں کی ٹپس

کسی بھی عورت کی عمر کا اندازہ اس کے ہاتھوں یعنی Hands سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آپ اپنے چہرے کو میک اپ کی دبیز تہوں میں چھپا سکتے ہیں لیکن جب ہاتھوں کی جلد کا نمبر آتا ہے تو کوئی ایسا میک اپ کا فارمولہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا جو ان کی عمر چھپا لے۔ تو پھر کیا کیا جائے کہ ہاتھوں کی جلد (hands skin) سے آپ کی عمر کا پتہ نہ چلے اور آپ کے ہاتھ جوان لگیں؟ اکثر خواتین یہ سوال کرتی ہیں اور کئی ماہرین آرائش سے پوچھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اگر آپ بھی جاننا چاہتی ہیں کہ آپ کے ہاتھ آپ کے چہرے کی طرح جوان اور خوبصورت لگیں تو نیچے بتائیں ہوئے ہینڈ ٹپس کو غور سے پڑھیے اور اپنے ہاتھوں کی جلد کو جوان رکھیے۔

ہاتھوں کی جلد کی احتیاط

آپ نے لاتعداد مرتبہ سنا اور پڑھا ہوگا کہ ہاتھ دھونے سے بہت سے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور انسان بہت سی بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے ہاتھ اکثر دھوتے ہیں لیکن اگر آپ کو ہاتھ دھونے کا صحیح طریقہ معلوم نہ ہو تو آپ کی ہاتھوں کی جلد متاثر ہو سکتی ہے۔ اگر آپ یہ جان لیں کہ آپ کے جلد کئی تہوں پر مشتمل ہے اور سب سے اوپر والی تہہ جو کہ مردہ خلیے ہیں اس سے نچلی تہہ میں زندہ خلیے موجود ہوتے ہیں اور یہ خلیے تیل خارج کرتے ہیں جو جلد کی بیرونی سطح کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان کی جلد میں جراثیم اور پانی داخل نہیں ہو سکتا۔ بیرونی جلد کی سطح نمی کو بھی جذب کرتی ہے اور جلد کو خشکی سے بچاتی ہے۔ کئی خواتین برتن یا کپڑے دھوتے ہوئے مختلف قسم کے صابن اور پاوڈر استعمال کرتی ہیں جس کی وجہ سے جلد کے اوپر کے تہہ میں نمی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ماہر جلد خواتین کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ایسے صابن کا استعمال کریں جو ان کی جلد کو نقصان پہنچائے بغیر دھلائی اور صفائی کا مرحلہ بخوبی انجام دے۔

ہاتھوں کی جلد کی نمی بچانے کا طریقہ

جلد کی نمی اڑنے سے بچانے کے لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ بہت گرم پانی کا استعمال نہ کریں۔ نیم گرم پانی سے برتن یا کپڑے دھوئیں اور مناسب یہ ہے کہ برتن یا کپڑے دھوتے ہوئے یا کوئی بھی ایسا کام جس میں پانی اور صابن کا استعمال ناگزیر ہو دستانے پہن لیں۔

ہاتھوں کی حفاظت

اپنے گیلے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر صاف نا کریں بلکہ کسی ٹیشو یا صاف ناول کی مدد سے ہولے ہولے انھیں خشک کریں۔ زیادہ رگڑنے کے عمل سے ہاتھوں کی جلد کو نقصان پہنچتا ہے اور جلد میں موجود تیل کی تہہ ختم ہو جاتی ہے۔

ہاتھوں کے ماسک اور کریم

جب بات حسن کی ہو تو اپنے ہاتھوں کی حفاظت کے لیے کریم اور لوشن کا استعمال ضرور کریں۔ ہمیشہ بہترین معیار کی کریم اور لوشن کا استعمال کیجیے۔ آپ کی بچت آپ کے ہاتھوں کی خراب جلد اور رنگت سے ظاہر ہو جائے گی لہٰذا اس معاملے میں ہرگز کنجوسی کا مظاہرہ نہ کریں۔ یاد رکھیے ہاتھ آپ کی شخصیت اور خوبصورتی بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں تو پھر ان کا خیال رکھنا آپ کے لیے بیحد ضروری ہے۔

(بحوالہ: www.asian-women-magazine.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

'ماہنامہ خواتین دنیا' جنوری 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ میرا تحریر کردہ مضمون ''توانائی اور طبی افادیت سے بھرپور مختلف ذائقے دار پھل' کو صحت عنوان کے تحت شائع ہوا ہے۔ خواتین کے لیے کوئی مخصوص رسالہ نکلے اس کی ضرورت عرصے سے شدت کے ساتھ سے محسوس کی جارہی تھی۔ کونسل نے اس رسالے کو شائع کر کے خواتین کو بہت بڑا تحفہ عطا کیا ہے۔ اس رسالے کا 'گیٹ اپ' کافی خوبصورت ہے۔ جس پر یوم جمہوریہ کا منظر شائع کیا گیا ہے جو گنگا جمنی تہذیب کا حصہ ہے۔ اس میں جتنے مضامین شائع کیے گئے ہیں وہ سب لاجواب ہیں۔ اس شمارے کا اداریہ خواتین کے تعلق سے بہت ہی کارآمد ثابت ہوگا کیونکہ عورتوں کو حمل کے دوران ہونے والی پریشانیوں پر مبنی ایک سچی کہانی بھی پیش کی گئی ہے جو امراض نسواں کی ماہر ڈاکٹر حنا شائم نے خصوصی طور سے خواتین دنیا کے لیے تحریر کی ہے۔

اردو کے فروغ کے لیے یہ شمارہ آفتاب کی مانند ہے جس کے ذریعے اردو کی سنہری کرنیں چاروں طرف بکھر رہی ہیں۔ سرورق سے لے کر آخری صفحہ تک اس رسالے کو ادبی گلدان بنانے میں قومی اردو کونسل نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ادارتی صلاحیت ہر ماہ کے شمارے میں جھلکتی ہے۔ محض 10 روپے میں بے حد معلوماتی، دیدہ زیب اور رنگین تصاویر سے آراستہ ایسا رسالہ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملے گا۔ شخصیت کے تحت ڈاکٹر شکیل اختر کا لکھا ہوا مضمون 'اردو نشریات کا ایک اہم نام: سعیدہ بانو' کافی معلومات افزا ہے۔ نکہت سخن کے تعلق سے وفا لکھنوی، شان معراج، مسعودہ حیات، صدیقہ شبنم، مظفر النساء ناز، سیما نظمی، کشور ناہید اور نور جہاں ثروت کی غزلوں کے اشعار بہت عمدہ ہیں۔ صفحہ 11 پر ڈاکٹر شہناز بیگم کا مضمون 'اردو میں غدر 1857 سے متعلق تاریخیں' کافی معلومات افزا مضمون ہے جو تاریخ کا مطالعہ کرنے والے طلبا کے لیے بے حد مفید ہے۔ ڈاکٹر شاہین فاطمہ' جاوید ناصر خاں'، محمد فیروز عالم کا مضمون 'ننھے دماغوں کو زنگ آلود ہونے سے بچائیں۔' صفحہ 22 پر ڈاکٹر عرشیہ جبین کا مضمون ''شمیم نکہت کے خاکوں کا تنقیدی مطالعہ'، نثار حسن کا مضمون 'ادب کی خواتین نوبل انعام یافتگان'، مومن سمیہ کا مضمون 'سوشل میڈیا اور طلبہ کی جسمانی و ذہنی صحت' اور صوفیہ محمود کا مضمون 'صالحہ عابد حسین کے افسانوں میں سماجی و طبقاتی شعور' کافی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور ہیں۔

کہانیاں عنوان کے تحت صفحہ 41 پر ڈاکٹر حنا شائم کی کہانی خواتین کے لیے بے حد مفید کہانی ہے۔ اس کے علاوہ رخسانہ نازنین کی کہانی 'اندھیرا اجالا' اور زائرہ حسینی کی کہانی 'امی' کافی دلچسپ کہانی ہے۔ حسن سخن

کے تحت ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی نظم 'میں عورت ہوں'، سائرہ عظیم، ڈاکٹر مسرور صغریٰ کی نظم 'خارستان' بہت عمدہ اور خوبصورت نظم ہے۔ امور خانہ داری کے تحت 'لڈو پیٹھیاں'، 'ہاٹ اینڈ اسپائسی ریشمی کباب رولز' اور آلو پاپڑی چاٹ وغیرہ عمدہ پکوان پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے خواتین زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گی اور استعمال میں لائیں گی۔ آرائش وزیبائش کے تحت صفحہ 58-57 پر شہد کے فوائد پیش کیے گئے ہیں جیسے خوبصورت اور دلکش جلد، کیل مہاسوں سے بچاؤ، چمکدار آنکھیں، شوگر پر قابو پانے میں بے حد مفید، امراض قلب کے خطرات کو کم کرنا، موٹاپا کا کم ہونا، جراثیم کا دفع ہونا، سینے اور گلے کا انفیکشن ختم ہونا۔ بہترین اینٹی بیکٹریل دوا اور سب سے آخر میں خواتین خبرنامہ میں میری کوم نے پنجاب کو دلائی فتح۔ بگ باٹ باکسنگ لیگ، ویٹ لفٹر راکھی نے قطر انٹرنیشنل لیگ میں کانسہ جیتا۔ دو نئے راشٹریہ ریکارڈ بنائے۔ لوگوں کی حمایت سے تیر اندازی میں ماہر اعتماد کا بڑھنا۔ وغیرہ خبریں سرخیوں میں ہیں۔

مختصر یہ کہ زیر نظر جنوری 2020 کا شمارہ ان ساری خوبیوں سے مزین ہے جن کی روشنی میں ہم 'خواتین دنیا' کو نہ صرف ایک مکمل خواتین رسالہ کہہ سکتے ہیں بلکہ اسے ایک تحریک نسواں سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یقیناً اس کی کامیابی کا سہرہ مدیران کونسل کے سر جاتا ہے کہ جن کی محنت و ریاضت سے اس رسالہ کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ امید ہے کہ مستقبل میں بھی خواتین دنیا اپنی چمک دمک قائم اور اپنی منفرد شناخت بنائے رکھے گا۔

محمد طاہر صدیقی، ایم اے۔ بی۔ ایڈ سال دوئم، گرو گوبند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی، دوارکا۔ نئی دہلی

'خواتین دنیا' اپنے آغاز سے ہی میرے مطالعے میں ہے۔ اردو زبان میں یہ واحد ایسا رسالہ ہے جس میں خواتین سے متعلق مضامین موجود ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ نہ صرف ادبی مضامین موجود ہوتے ہیں بلکہ خواتین سے متعلق ایسے کالم بھی رسالے میں ہیں جو خواتین کے لیے ہی خاص طور پر مختص کیے گئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت جنوری کا شمارہ ہے۔ اس شمارے نے مجھے کافی متاثر کیا ہے۔ اس کے مضامین زیادہ تر خواتین کے ذریعے ہی تحریر شدہ ہیں۔ حنا شمائم کی کہانی 'پہلا بچہ' بھی پسند آئی۔ رخسانہ نازنین اور زائرا حسینی کی کہانیاں بھی توجہ طلب ہیں۔ صحت کے متعلق جو مضمون دیا گیا ہے اس میں تمام اقسام کے پھلوں کی افادیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آرائش وزیبائش کے تحت شہد کے فوائد درج کیے گئے ہیں۔ خواتین خبرنامہ اور تاثرات بھی اہم ہیں۔ امید کرتی ہوں کہ یہ رسالہ اسی طرح اپنی آب وتاب قائم رکھے گا۔

ناہید، علی گڑھ، یوپی

'خواتین دنیا' فروری 2020 موصول ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے جس میں شائع ہونے والی تمام تخلیقات یا تو خواتین کے ذریعے لکھی جاتی ہیں یا خواتین پر ہی مرکوز ہوتی ہیں۔ اس میں شائع ہونے والے تمام مضامین معیاری اور معلوماتی ہوتے ہیں چاہے وہ ادب کی دنیا ہو یا کھیل کی دنیا، باورچی خانہ ہو یا آرائش وزیبائش، صحت کا موضوع ہو یا خواتین کے ذریعے حاصل کی گئی مختلف میدانوں میں نمایاں کارکردگی غرض ہر طرح کا مواد اس رسالہ میں موجود ہوتا ہے۔ رسالہ کی قیمت بھی بہت معمولی رکھی گئی ہے تاکہ تمام لوگ اس سے فیض یاب ہوسکیں۔ آپ تمام لوگوں سے بھی گزارش ہے کہ مزید ممبرس بنائیں اور اس رسالے سے فیض حاصل کرسکیں۔

شبنم، مظفر نگر، یوپی

'خواتین دنیا' مارچ 2020 نظر نواز ہوا۔ حسب سابقہ شمارہ بھی کافی معلوماتی ہے۔ جاذب سرورق نے دل موہ لیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں سے شائع ہونے والے رسالوں کا مواد معیاری ہوتا ہے۔ اس مہینے کا اداریہ خواتین پر لکھا گیا ہے جو ہمیں غور وفکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اداریہ کے علاوہ اس شمارے میں کئی مضامین موجود ہیں۔ روبرو کے تحت رفیعہ شبنم عابدی کا انٹرویو شامل ہے۔ شخصیت کے تحت نور جہاں ثروت پر مضمون موجود ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی خواتین کے ذریعے ہی لکھے گئے ہیں جو ادب میں خواتین کی نمائندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ کہانیاں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں علاوہ ازیں صحت سے متعلق مضمون بھی کھانا پکانے سے متعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ خواتین خبرنامہ بھی لائق توجہ ہے۔ غرض اس شمارے کا تمام مواد توجہ طلب ہے۔

شبینہ، مصطفیٰ آباد، یوپی

معصوم زہرہ کے ذریعے لکھا گیا مضمون 'خواتین کو بااختیار بنانے کے اہداف اور حقیقت' توجہ طلب ہے۔ مذکورہ مضمون میں خواتین کے لیے جو اہداف مقرر کیے گئے ہیں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر شہناز خاتون کا افسانہ 'زندگی خود ہی گناہوں کی سزا دیتی ہے' کافی پسند آئی۔ اس افسانہ میں انھوں نے سگے رشتوں کی اہمیت اور ان کے رشتوں کے ذریعے کیے گئے سلوک کو کہانی کا موضوع بنایا ہے۔

عائزہ نسیم، مائی گھاٹ چوک، فیض کالونی، مظفر پور، بہار

□□□

عالمی یوم خواتین کے موقع پر خواتین کی غیر معمولی سماجی خدمات کو خراج صدر جمہوریہ کے ہاتھوں 15 خواتین کو ’ناری شکتی پرسکار‘

نئی دہلی۔ 8 مارچ، مصنف، حیدرآباد (پی ٹی آئی)۔ صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے عالمی یوم خواتین کے موقع پر معاشرہ میں مثبت تبدیلی کے نقیب کا رول ادا کرنے والی 15 خواتین کو ”ناری شکتی پرسکار“ سے نوازا۔ ان میں جھارکھنڈ کی لیڈی ٹارزن کی حیثیت سے شہرت رکھنے والی اتھلیٹ مان کور جن کی عمر 103 سال ہے اور مشروم کاشت کاری میں انقلاب برپا کرنے والی بنا دیوی شامل ہیں جو مشروم خاتون کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں 58 سالہ کلاوتی دیوی کو بھی اعزاز سے نوازا گیا جو کانپور میں کھلے عام بیت الخلا کے خلاف مہم چلا رہی ہیں۔ راشٹرپتی بھون میں منعقدہ اس تقریب میں خواتین واطفال ترقیات کے مرکزی وزیر اسمرتی ایرانی کے علاوہ وزارت کے سینئر عہدیدار اور معزز شخصیتیں موجود تھیں اعزاز حاصل کرنے والی خواتین میں آندھرا پردیش میں سریکا کلم کی پدالا بھودیوی، بہار میں مونگیر کی بینا دیوی، جموں وکشمیر میں سری نگر کی عارفہ

جان، جھارکھنڈ میں سرائے کیلا کھارسوان راج نگر کی چامیی مرمو، لداخ میں لیہہ کی ٹلجا وانگمو، مہاراشٹر میں پونے کی رشم ادھواریش، پنجاب میں پٹیالہ کی سردارنی مان کور، اتر پردیش میں کانپور کی کلاوتی دیوی، اترا کھنڈ میں دہرادون کی تاشی اور نگاشی ملک، مغربی بنگال میں کولکاتہ کی کوشکی چکرورتی، کیرالہ میں الپزا کولم کی بھگیرتھی اماں کارتھیاینی اور انڈین ایئر فورس میں مدھیہ پردیش، ریوار کی اونی چتر ویدی، بہار در بھگنہ کی بھاونا کنٹھ اور اتر پردیش، آگرہ کی موہنا سنگھ کو'ناری شکتی پرسکا2019' پیش کیا گیا۔ کیرالا میں الاپوزا کی بھگیرتھی اماں ضعف کی وجہ سے ایوارڈ قبول کرنے راشٹر پتی بھون نہیں آسکیں۔2019 کے ناری شکتی پرسکار زراعت، کھیل، دستکاری، جنگلات، وائلڈ لائف کے تحفظ، مسلح افواج اور تعلیم کے میدان میں پیش کیے گئے ہیں۔

وزیر اعظم نے 7 خواتین کو اپنا سوشل میڈیا اکاؤنٹ حوالہ کر دیا

نئی دہلی، 8 مارچ (یو این آئی) وزیر اعظم نریندر مودی نے خواتین عالم دن کے موقع پر اتوار کی صبح اپنا سوشل میڈیا اکاؤنٹ سات خواتین کے ہاتھوں میں سونپ دیا، جو اپنی زندگی سے جڑے یادگار لمحوں کو شیئر کریں گی۔ مودی نے ٹوئٹ کیا" بین الاقوامی یوم خواتین پر مبارک باد۔ ہم 'عورتوں کی

طاقت' کا احساس اور کامیابیوں کو سلام کرتے ہیں، جیسا کہ میں نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ خواتین کے عالمی دن کے موقع پر میں سوشل میڈیا سے دور رہوں گا۔ آج دن بھر سات خواتین اپنی زندگی سے جڑے یادگار لمحوں کو شیئر کریں گی اور سوشل میڈیا اکاؤنٹس کے ذریعے بات چیت کریں گی۔' وزیر اعظم نے دو مارچ کو سوشل میڈیا چھوڑنے کے حوالہ سے ٹویٹ کیا تھا۔ مودی نے لکھا تھا' اس اتوار کو میں اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹس۔ فیس بک، ٹوئٹر، انسٹا گرام، یوٹیوب چھوڑنے پر غور کر رہا ہوں۔ آپ کو اس بارے میں معلومات دوں گا۔' جس کے بعد اگلے دن وزیر اعظم مودی نے بتایا کہ خواتین کے عالمی دن کو خاص بنانے کے لیے وہ اس ویمنز ڈے پر اپنے سوشل میڈیا اکاؤنٹ ایسی خواتین کو سونپیں گے جن کی زندگی اور کام ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس سے انھیں لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں مدد ملے گی۔ قابل غور ہے کہ وزیر اعظم نے فیس بک پیج پر 734,723,44 لائکس ہیں جبکہ ٹوئٹر پر انھیں 5 کروڑ 30 لاکھ لوگ فالو کرتے ہیں۔

کشمیر کی رہنے والی منزہ غازی نے روس میں ہندوستان کا نام روشن کیا

3 مارچ 2020 (انقلاب ڈاٹ کام) کشمیر کی رہنے والی منزہ غازی نے روس میں ہندوستان کا نام روشن کیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق یہاں منعقدہ مارشل آرٹ کی ایک قسم 'ووشو' کے عالمی مقابلہ میں منزہ نے سونے کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

تفصیلات کے مطابق روس کے دارالحکومت ماسکو میں 25 سے 29 فروری کے درمیان 'ماسکو ووشو اسٹارس ووشو چمپئن شپ' کا انعقاد کیا گیا۔ یہاں سری نگر کی رہنے والی منزہ غازی نے 60 کلو گرام کے زمرے میں ہندوستان کی نمائندگی کی اور اپنے شاندار کھیل کی بدولت ہندوستان کو اس کیٹیگری میں ووشو چمپئن بنایا۔ قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کی ووشو ٹیم نے اس چمپئن شپ میں 6 گولڈ، 6 سلور اور 3 برونز میڈل جیتے ہیں۔ قبل ازیں اس چمپئن شپ کے لیے چنڈی گڑھ میں 25 دنوں کا تربیتی کیمپ منعقد کیا گیا۔ واضح رہے کہ منزہ غازی سری نگر کی رہنے والی ہیں اور ووشو کی ایک بہترین کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے اب تک ریاستی، قومی مقابلوں کے ساتھ ساتھ عالمی ٹورنامنٹ میں بھی کئی تمغے اپنے نام کیے ہیں۔ قبل ازیں منزہ نے دسویں ایشین ووشو چمپئن شپ میں ہندوستان کو سلور میڈل جتایا تھا۔ اطلاعات کے مطابق منزہ یکم مارچ کو روس سے لوٹیں۔ ان کی واپسی پر ڈسٹرکٹ ووشو اسوسی ایشن کی جانب سے استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

صحت الفاظ

مصنف: سید بدرالحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات

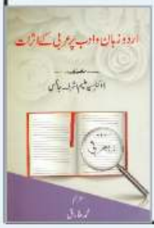

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم: محمد طارق

صفحات: 507

قیمت: 225 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

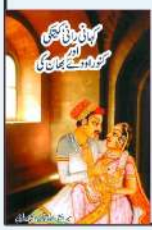

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

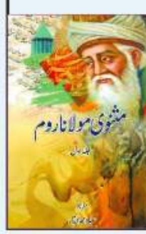

مترجم: سید احمد ایثار

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 223 (جلد اوّل)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)

قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

تذکرہ شعرائے رام پور

فارسی تصنیف: جارج فانتوم متخلص بہ صاحب وجرجیس

اردو ترجمہ وحواشی: مصباح احمد صدیقی

صفحات: 123، قیمت: 90 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2020, Vol. 4, Issue: 4
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025